دسمبر ۲۰۰۴ء/ذی القعدہ ۱۴۲۵ھ

ماہنامہ شعاع عمل لکھنؤ

موسسہ نور ہدایت حسینیہ غفران مآبؒ لکھنؤ-۳

Monthly

R.N.I.No. UPBIL/2004/13526 - December-2004

SHUA-E-AMAL

Lucknow

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab, Chowk
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230

فہرست مضامین

دسمبر ۲۰۰۴ء

سخنان

ماہنامہ ''شعاع عمل'' کا شمارہ ہشتم جن معصوموں کی تاریخہائے ولادت وشہادت سے متعلق ہے وہ ہمارے آٹھویں اور نویں امام یعنی امام ضامن حضرت علی رضا علیہ السلام اور حضرت محمد تقی علیہ السلام ہیں۔

سید العلماءؒ فرماتے ہیں ''...... حضرت امام رضاؑ کو جنھیں سلطنت بنی عباس کے ولی عہد بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا، یہ مثال پیش کرنے کا موقع ملا کہ ابنائے دنیا کے اندر رہتے ہوئے اور دنیاوی سلطنت کے ماحول اور دنیاوی سیاست کے اندر قدم رکھتے ہوئے، پھر کس طرح ہر ہر قدم پر اپنے خدا کی مرضی کو پیش نظر رکھا جاتا اور اپنے دامن پر کسی قسم کی کوتاہی کا دھبا نہیں آنے دیا جاتا اور ہر حال میں اپنے اس بلند فریضہ کو پورا کیا جاتا ہے جس کے لیئے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

حضرت امام محمد تقیؑ کی عمر معصومینؑ میں سب سے مختصر ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ کوئی زندگی اگر نوع انسانی کے لیئے صحیح نمونہ بن کر سامنے آئی ہو تو چاہے وہ بہت کم وقت میں ختم ہو جائے مگر اس کے پائدار نقش جو انسانی دماغوں پر قائم ہو گئے ہیں کبھی نہیں مٹتے اور باوجود اپنے مختصر ہونے کے نتیجہ کے لحاظ سے اور افادیت پر نظر کرتے ہوئے تاریخ انسانی کا وہ اتنا ہی اہم باب قرار پاتی ہے جتنا زیادہ عمر کو حاصل کر کے کسی انسان کی زندگی ہو سکتی ہے۔''

کاش ہم ان ذوات مقدسہ کے کردار و عمل سے استفاضہ کر کے اللہ تعالیٰ اور صاحبان عصمت کی خوشنودی حاصل کرتے۔

آقائے قوم قدوۃ العلماءؒ کی تحریک دینداری و بیداری

آقائے قوم نے ملت کے علمی و عملی معیار کو بلند کرنے کے لیئے اور قوم کی پستی و بلندی کے اتفاقات و حادثات و واقعات کو تحریری صورت میں ہر ایک تک پہونچانے کے لیئے لکھنؤ کی شیعی دنیا کا پہلا رسالہ ماہنامہ ''معالم'' یکم محرم الحرام ۱۳۱۸ھ میں جاری فرمایا جس کے قدوۃ العلماء مولف و مدیر تھے اور ساتھ ہی اخبار ''الناطق'' جاری فرمایا۔ یہ بھی اولیت و دیگر خصوصیات کے اعتبار سے 'معالم' ہی کا ہم پلہ تھا۔ یہ رسالہ اور اخبار پہلے تصویر عالم پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر دفتر عماد الاسلام جوہری محلہ سے شائع ہوتے تھے جو بعد قیام مطبع عماد الاسلام اپنے ہی پریس میں طبع ہونے لگے۔ دفتر اور مطبع دونوں کے مالک ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین نقوی تھے۔ اخبار و ماہنامہ دونوں نے برسوں بلکہ انجمن صدر الصدور کے شیعہ کانفرنس بننے تک

قرآن مجید

کاملیت و ہمہ گیری ـــــ تکمیل انسانیت واخلاق اورقرآن

محقق کبیر علامہ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری طاب ثراہ

قرآن مجید کا دعویٰ ہے (ہم نے کتاب میں کوئی شئے بغیر بیان کے نہیں چھوڑی ہے) ـــــ قرآن مجید نے زندگی کے کل بنیادی اصول بیان کر دیئے ہیں انھیں تفصیل و شرح واستنباط کی روشنی میں ہر آنے والا دور اپنے نئے نئے مسائل کا اخذ کرے گا اور کرتا ہے۔ساڑھے تیرہ سو سال میں قرآن مجید کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو گئی ۔ اور کروروں انسانوں نے اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال کر اس کا عملی ثبوت دیا کہ یہ ایک مکمل دستور زندگی ہے اور زندگی کے کل شعبوں پر محیط ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہر فضا و ماحول میں قرآن مجید نے پوری پوری رہنمائی کی۔ علوم و فنون کے سیلاب نے جبکہ سیکڑوں اوہام وخرافات کو خس و خاشاک کی طرح فنا کر دیا اور ہزاروں مذاہب وملل اور فلسفے نیست و نابود ہو گئے۔قرآن اور اس کا نظام زندگی اسی طرح انتہائی توانائی سے قائم ہے، اسکے اسرار ورموز وحکم ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔ ذہین انسان اس کے اصول وحکم کے پیچھے دوڑ رہا ہے مگر اس ذخار سمندر کا کنارہ انسان کو ابھی تک نہیں ملا۔اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ کبھی اس کا کنارہ نہ ملے گا۔

قل لو کان البحر ـــــــــــــــ کلمات ربی

(ترجمہ) اے پیغمبر آپ یہ پیام سنا دیں کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں جب بھی اسرار کلمات الٰہی کا احاطہ ناممکن ہے۔سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا لیکن کلمات الٰہی اور اس کے اسرار کا احاطہ نہ ہو سکے گا۔

قرآن مجید نے ایک عجیب وغریب دلکش انداز ہدایت پیش کیا۔معرفت الٰہی جسے صرف وجدانی و ذوقی چیز سمجھا جاتا تھا اسے علم وحکمت ومطالعہ نشر وآفاق پر مبنی قرار دیا گیا۔ قرآن مجید کی قوت قیادت حیرت انگیز ہے دلائل کا استحکام اس سے مخصوص ہے۔ ماضی وحال و مستقبل کے نامعلوم واقعات اس میں اس طرح موجود ہیں کہ نئے نئے انکشافات روز اس کی تفسیر وشرح پیش کر رہے ہیں۔ اس سچائی کو دلنشین کرنے کا نیا قدرتی اسلوب اختیار کیا گیا۔اس میں بہتر سے بہتر مذہب اور اونچے سے اونچے قوانین موجود ہیں ۔ اس میں روحانیت کے اعلیٰ اصول ہیں۔صحت ونمو جسمانی تنومندی کے بہترین آئین موجود ہیں۔ فرد کے تقاضے اس میں ہیں، جماعت کے مطالبے اس میں ہیں۔

نوع انسانی کو عقل ودماغی تکمیل وترقی کے لیے جن ضابطوں کی ضرورت ہے وہ اس میں پائے جاتے ہیں۔

اس کے احکام کی بنیاد قوانین فطرت پر قائم ہے۔ اس لیے یہ ہر زمانے کے جائز و ضروری تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہے۔ اختلاف و تضاد و نقص و تعصب و تنگ نظری سے پاک ہے۔ اس کے الفاظ و معانی میں اسقدر زندگی ہے کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد دل سیر نہیں ہوتا اور نہ اس کے مضامین کی شگفتگی میں کمی آتی ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کے سامنے اس عجیب ثقافتی معجزے کی جب توجیہ پوچھی گئی تو حضرت نے فرمایا:

سوال ہوا کہ:۔ کیا وجہ ہے کہ قرآن میں تعلیم و اشاعت سے اور شگفتگی آتی ہے۔ امامؑ نے فرمایا: ــــ اس لیے کہ خدا نے اسے کسی خاص زمانے کے مسائل سے مخصوص نہیں فرمایا ہے نہ کسی خاص قوم و جماعت سے مخصوص قرار دیا ہے۔ وہ ہر زمانے میں نیا ہے اور ہر قوم کے لیے ناز ہے اور قیامت تک اس کی تازگی میں یوں ہی اضافہ ہوتا رہے گا۔

(امالی بن شیخ محمد بن طوسی مطبوعہ ۱۳۱۳ھ)

کوئی تاریخی زمانہ اور کوئی انسانی جماعت اس کے اثرات تعلیم کی ہمہ گیری سے مستثنیٰ نہیں۔ کئی عظیم جنگیں سائنس کے غلط استعمال سے اپنی ہولناکی کا منظر پیش کر چکی ہیں۔ ان کو قرآن کی ان آیات کی روشنی میں پڑھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ آیتیں آج ہی نازل ہوئی ہیں:

(ترجمہ) خدا اس بات پر قادر ہے کہ فضا سے اور زمین کے اندر سے تمھیں عذاب میں مبتلا کرے اور تمھیں پراگندہ کر دے اور ایک کو دوسرے کے خوف و دہشت کا مزہ چکھائے۔

(ترجمہ) انتظار کرو جبکہ فضا سے دھواں اٹھے گا اور لوگ تکلیف و عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ذیل کی آیات میں ہولناک جنگوں کے اسباب بھی مذکور ہیں۔

(ترجمہ) خدا نے ایک گاؤں کی مثال سے یہ سمجھانا چاہا ہے کہ قومیں کس طرح اپنی سرکشی و کفران نعمت سے برباد ہوتی ہیں ــــ ''ایک گاؤں تھا جس میں لوگ خوشحال و مطمئن و فارغ البال رہتے تھے۔ اسباب معیشت نہایت آسانی سے مہیا ہو جاتے تھے ان لوگوں نے کفران نعمت کیا اور اس کے نتیجہ میں خدا نے ان کو بھوک اور خوف کا مزا چکھایا۔

قرآن مجید کی ہمہ گیری و کاملیت و جامعیت کا یہ حال ہے کہ اس سے طب و صحت و تاریخ طبعی علم الحیوان و کیمیا و طبقات الارض و بیالوجی و طبیعیات (ہوا، پانی، آگ، گرمی، آواز، روشنی، کہرا، مقناطیسیت، ، فلکیات، جغرافیہ، تقویم بلدانی، بحری سفر، تیراکی، سیاحت، تاریخ اثری، تاریخ عام، فنون جنگ، صنعت و حرفت، تجارت، حساب و ہندسہ و تعمیرات و انشاء وغیرہ) کے لیے علماء نے ہدایتیں پائیں اور متعدد کتابیں علوم قرآن پر عالم وجود میں آئیں۔ قرآن مجید کے چند مسائل پر اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔تخلیق و ایجاد ــــ ان اللہ خالق کل شئی (خدا ہر چیز کا خالق ہے)

۲۔علم و قدرت ــــ (تمہارا پروردگار خالق و عظیم ہے حاضر و غائب سب سے واقف ہے) (جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ عالم و قادر ہے۔)

۳۔ ربوبیت ــــ(ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے بقدر ضرورت اسے ہم نازل کرتے ہیں۔ ہر شئے اس کے پاس ایک خاص مقدار میں موجود ہے) (لوگو نعمت الٰہی کو یاد کرو کیا خدائے واحد کے علاوہ کوئی اور خدا ہے) وہ تم کو فضا اور زمین سے رزق دیتا ہے وہی روزی رساں اور صاحب قوت ہے۔

۴۔توحید ــــ(وہی آسمان پر خدا ہے اور وہی زمین پر خدا ہے)

۵۔خدا کے سفیر ــــ لقدر ارسلنا رسلنا بالبینات (ہم نے اپنے رسول دلائل کے ساتھ بھیجے) (خدا بہتر جانتا ہے کہ اسے کسے نبی بنانا چاہیے)

(ہم کسی قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتے جب تک رسول بھیج کر اتمام حجت نہیں کرتے۔)

(ہر امت میں خدا کی طرف سے عذاب الٰہی سے ڈرانے والے نبی آتے رہے ہیں)

(گذشتہ اقوام میں بہت سے نبی آتے رہے ہیں)

(ہر امت میں ہم نے پیغمبر بھیجے)

۶۔ رسالت محمدیہؐ ــــ (ہم نے تم کو کل انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے)

۷۔ جنت و دوزخ ــــ(جنت آسمان وزمین کی عرض کی طرح ہے)

۸۔فرشتے ــــ(خدا کی فوج کا علم اسی کو ہے)

(حاملان عرش تسبیح الٰہی کرتے ہیں)

۹۔ جبرئیل ــــ(کہیے کہ اسے روح القدس خدا کی جانب سے لائے ہیں)

۱۰۔جن ــــ(جن وانس کی خلقت عبادت کے لیے ہے)

۱۱۔حضرت آدم علیہ السلام ــــ(خدا نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بناؤں گا جب وہ بن جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے تو تم سب اس کی تعظیم کرنا)

۱۲۔شرف انسانی ــــ(ہم نے بنی آدم کو پیدا کیا اور ان کے لیے خشکی و دریا میں چلنے کے اسباب مہیا کیے اور حلال روزی اور بہت سی مخلوق پر انھیں فضیلت دی)

۱۳۔شریعت الٰہی ــــ(جو احکام خدا نے بھیجے ہیں ان پر عمل کرو)

۱۴۔نیکی و بدی کی تمیز کے مواقع ــــ(ہم نے تمہاری رہنمائی کردی ہے خواہ تم شکر گزار بنو یا کافر نعمت)

۱۵۔انسانی اختیار ــــ(اچھے اور برے کام جو کرو گے اس کی ذمہ داری تمھیں پر ہے۔ اچھا کام کرو گے اس سے تمھیں فائدہ ہوگا۔ برا کام کرو گے اس سے نقصان اٹھاؤ گے)

۱۶۔عدالت الٰہی ــــ(اے رسولؐ کہہ دو کہ عالم اور جاہل کیا دونوں مرتبہ میں برابر ہوسکتے ہیں؟ (ہر گز نہیں) اہل عقل اس فرق کو سمجھتے ہیں) (۲۳ــــ۱۴) (کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم انھیں اہل ایمان اور صالحین کے برابر کردیں گے جو زمین پر فساد برپا کرتے اور فاجروں کو پرہیزگاروں کے برابر کردیں گے) (ہرگز نہیں)

۱۷۔اصلاح نفس ــــ(کامیاب وہ ہے جس نے اصلاح نفس کی اور ناکام وہ ہے جس نے نفس کو گندہ کیا) (جسے خوف الٰہی ہوگا اور جو نفس کو اپنے برے اقدامات سے روکے گا جنت اس کی فرودگاہ ہوگی)

۱۸۔اصول تبلیغ ــــ (خدا کی طرف حکمت وموعظہ حسنہ سے دعوت دواور بہترین طریقہ سے بحث کرو)

۱۹۔فرقہ بندی ــــ (آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ کمزور ہوجاؤ گے) (ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو فرقہ بندی میں مبتلا ہوگئے اور روشن دلیل آنے کے بعد بھی اختلاف میں پڑ گئے) ــــ (پس پراگندہ نہ ہو، دین الٰہی کے رشتے کو مضبوطی سے پکڑو)

۲۰۔موت وحیات ــــ (تم مردہ تھے (مٹی) تمھیں خدا نے زندہ کیا پھر تم پر موت طاری کرے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا۔)

۲۱۔برزخ ــــ (تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)

۲۲۔روز جزاء ــــ (کیا انسان نے یہ سمجھا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا) یعنی کوئی مقصد اس کی زندگی کا نہیں اور نہ کوئی محاسبہ ہوگا۔

(کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس پلٹ کر نہ آؤ گے)

۲۳۔قیامت ــــ (قیامت کا دن وہ ہوگا کہ زمین وآسمان سب بدل جائیں گے)

(اور سب انسان خدائے واحد وقہار کے سامنے حاضر ہوں گے)

۲۴۔فیصلہ ــــ (اس دن کچھ لوگ جنت میں جائیں گے اور کچھ لوگ جہنم میں)

۲۵و۲۶۔علم وحکمت ــــ (خدا جسے چاہتا ہے علم وحکمت سے نوازتا ہے جسے علم وحکمت کا فیض ملا اسے سب کچھ ملا)

۲۷۔جہالت ــــ (اگر تم میں سے سو آدمی ہوں مگر ہزار کافروں پر غالب ہوں گے کیونکہ کافر بے علم ہیں)

۲۸۔تواضع ــــ (اپنے بازو مومنین کے لیے جھکاؤ) (۱۴-۶)

۲۹۔کبر ــــ (جن لوگوں نے نفرت کی اور غرور وتکبر سے کام لیا وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے) (۱۶-۶)

۳۰۔دشمنی ــــ (اہل ایمان میں دوستی سے کام لو شیطان کی پیروی نہ کرو (دشمنی سے کام نہ لو) شیطان تمہارا (کھلا) دشمن ہے۔

۳۱۔سخاوت ــــ (جو لوگ خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے اپنا مال صرف کرتے ہیں۔ ان کی مثال اس دانے کی ہے جسمیں سات بالیاں ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ جسے چاہتا ہے دگنا کرتا ہے۔)

۳۲۔بخل واسراف ــــ (نہ بخل کرو اور نہ اسراف)

۳۳۔صلۂ رحم ــــ (معبود برحق سے ڈرو جس کا تم واسطہ دیتے ہو اور رشتہ دار کے معاملہ میں خدا سے ڈرو (بدسلوکی نہ کرو) (۳)

۳۴۔والدین ــــ (ماں باپ سے دنیا میں نیکی سے پیش آؤ اور ان سے جھک کے ملو اور خدا سے ان کے لیے یوں دعا کرو معبود جس طرح انھوں نے میرے بچپنے میں میرے ساتھ کریمانہ برتاؤ کیا تو بھی ان پر رحم کر)

۳۵۔غیبت ــــ (ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو نہ اس کی ٹوہ لیا کرو۔)

۳۶۔اصلاح ــــ (اپنے بھائیوں کے جھگڑوں کی اصلاح کرو۔)

۳۷۔بغاوت ــــ (خدا فحش اور بری باتوں سے منع کرتا ہے اور بغاوت سے روکتا ہے۔)

۳۸-وعدہ ــــ(اچھے لوگ اپنی نذر (وعدہ) کو پورا کرتے ہیں اور روز قیامت سے ڈرتے ہیں۔)

۳۹-انصاف ــــ(عدل سے کام لو یہ پرہیزگاری سے بہت قریب ہے)

قرآن مجید میں اخلاقیات پر بہت توجہ کی گئی ہے اگر ان آیات کو نقل کیا جائے تو قرآن کے بڑے حصہ کو نقل کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔

۴۰-اسلامی سیاست ــــ اسلام فرد و جماعت دونوں کی تکمیل کی ذمہ داری لیتا ہے اس نے اگر تہذیب نفس و تدبیر منزل کے مسائل بتائے تو تمدنی مسائل و اجتماعی قوانین کو بھی بڑی شد و مد سے بیان کیا۔

۴۱-اجتماعی عدالت ــــ انصاف و عدالت میں کسی قوم کا پاس نہیں کیا بلکہ قرآن میں اعلان کیا ''جب تم انسان کے مسائل کا فیصلہ کرنے پر مامور ہو تو عدل سے کام لو۔(۵-۵)

۴۲-خود اعتمادی و تنظیم عسکری ــــ(مخالفین کے تحفظ کے لیے پوری کوشش سے منظم ہو جاؤ۔ قوت اور سواری کا انتظام رکھو جس سے خدا کے اور اپنے دشمن کو مرعوب کر سکتے ہو۔)

۴۳-ادائے امانت ــــ بھی ایک اسلامی اخلاق ہے اور مومن و کافر سب کے لیئے عام ہے۔ ''خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ جن کی امانتیں تمہارے پاس ہیں ان کو واپس کردو'' (۵-۵)

۴۴-فساد کی مذمت ــــ ''ملک میں اصلاح کے بعد فتنہ انگیزی کرتے نہ پھرو۔'' (۸)

۴۵-تعزیرات و حدود ــــ(زناکار عورت و مرد کو سو سو کوڑے مارو۔)(چور مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹو یہ ان کے کرتوت کی سزا ہے۔)(کسی کو بے وجہ قتل نہ کرو۔)

(جو کسی مومن کو ارادۃً قتل کرے وہ ہمیشہ جہنم میں جلے گا اس کے لیے خدا نے سخت عذاب مقرر کر رکھا ہے۔)

(مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مومن کو قتل کرے۔ اگر غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کے عزیزوں کو دیت دیدو اور ایک مومن غلام آزاد کرو یا غلام کے عوض میں مسلسل دو مہینے روزے رکھو۔)

(اے اہل ایمان تمھیں مقتول کے عوض اجازت دی گئی ہے، آزاد کے بدلے آزاد کو قتل کرو، غلام کے بدلے میں غلام کو، عورت کے بدلے میں عورت کو، اور اگر کوئی بھائی معاف کردے تو یہ اس کا اچھا فعل ہے۔)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆ اِذَا اَحَبَّ اَحَدُکُمْ اَنْ یُحَدِّثَ رَبَّهُ فَلْیَقْرَأِ الْقُرْآنَ

''جب بھی تمہارا خدا سے گفتگو کو دل چاہے تو قرآن مجید کی تلاوت کرلیا کرو۔'' (کنزالعمال: حدیث ۲۲۵۷)

☆ فَضْلُ الْقُرْآنِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰی خَلْقِهِ

''قرآن کو دوسرے تمام کلام پر ویسی ہی فضیلت اور برتری ہے جیسی خدا کو اپنی مخلوقات پر۔'' (بحارالانوار جلد ۹۲ ص ۱۹)

امام علی رضا علیہ السلام اور سیاسی جد و جہد

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

ترجمہ: مولانا سید ولی الحسن رضوی

امام رضا علیہ السلام کا دور

جب بات امام رضا علیہ السلام تک پہونچتی ہے حالات دوبارہ بہتر ہو جاتے ہیں۔ امامؑ کو نسبتاً سکون کے ساتھ تبلیغ و اشاعت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ ہر طرف شیعہ پھیلتے نظر آتے ہیں، امکانات میں بھی اتنی فراوانی پیدا ہو جاتی ہے کہ مسئلہ امامؑ کی ولی عہدی پر جا کر منتہی ہوتا ہے اگر چہ جب تک ہارون بقید حیات رہا امام ہشتمؑ کو بھی خاموشی اور تقیہ کی زندگی بسر کرنی پڑی پھر بھی آپ کی جد و جہد اور سیاسی مہم جاری رہتی ہے، اسلامی تحریک اور تبلیغ و ابلاغ میں خلل پیدا نہیں ہو سکا گو کہ یہ سارے کام مکمل احتیاط کے ساتھ خفیہ طور پر انجام پاتے ہیں — انسان سمجھ سکتا ہے مثال کے طور پر دعبل خزاعی کا حضرتؑ کی ولی عہدی کے دوران ان الفاظ میں مدح سرائی کرنا ظاہر ہے یہ چیز یکایک زمین سے نہیں برآمد ہو گئی تھی — وہ معاشرہ جس میں دعبل خزاعی جیسی شخصیت پرورش پا رہی ہو اور ابراہیم ابن عباس جو حضرت کے مداحوں میں سے ہیں یا اسی قسم کے دوسرے کئی افراد جہاں موجود ہوں اس کی ثقافت و معاشرت میں خاندان رسول کے ساتھ محبت و ارادت کا عنصر موجود ہونا ایک بدیہی سی بات ہے ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی بنیاد کے دفعتاً مدینہ، خراسان، رَے نیز دیگر دور دراز علاقوں میں لوگ امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا جشن منانے لگتے ہیں سوائے اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ پہلے سے اس طرح کے نقوش مرتب ہو رہے تھے۔ وہ حالات و واقعات جو امام علیہ السلام کی ولی عہدی کے دوران پیش آتے ہیں (بڑی اہمیت کے حامل ہیں) ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت کی ولی عہدی کے دوران عوام کے جوش و جذبات، اہلبیتؑ کی محبت و عقیدت کے سلسلہ میں بڑی اونچی سطح پر پہونچ چکے تھے۔ بہر حال بعد میں امین اور مامون کے درمیان شدید اختلاف کی وجہ سے بغداد و خراسان کے درمیان پانچ سال تک جنگ و جدال کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور یہ چیز امام رضا علیہ السلام کے لیئے اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ولی عہدی کے ساتھ اپنی انتہا کو پہونچ جاتا ہے افسوس بس اس بات کا ہے کہ یہاں بھی امامؑ کی شہادت کی وجہ سے رشتۂ رشد و ہدایت قطع ہو جاتا ہے اور ایک بار پھر ایک نئے دور سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو اہلبیتؑ کے لیئے جانفشانی اور غم و آلام کا دور کہا جا سکتا ہے۔ میری نظر میں امام جواد علیہ السلام اور آپ کے بعد کا دور اہلبیت علیہم السلام کے لیئے ہمیشہ سے زیادہ بدتر دور رہا ہے اور اس میں

ان حضرات کو سب سے زیادہ محنت و جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی کا مجموعی خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کردیا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کردیا تھا کہ میں اپنی بحث کو دو حصوں میں منقسم کر رہا ہوں جس کا ایک حصہ یہی مجموعی سیاسی خاکہ تھا جو اس منزل پر تمام ہوجاتا ہے۔ اب رہی دوسرے حصہ کی بات جو ائمہ علیہم السلام کی اس سیاسی جدوجہد کے نمود و اثرات سے متعلق ہے۔ اس وقت شاید اس سلسلہ میں تفصیلی بحث نہ ہوسکے لیکن وہ چیز جو میں نے محسوس کی ہے اور ادھر وقت نکال کر دو ایک روز اس پر کام کرسکا ہوں محض عنوان کے طور پر یہاں ذکر کردینا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ ذہن میں رہے کہ تمام قابل بحث عنوانات میں نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیئے نمونہ کے طور پر صرف چند عنوانات حاضر خدمت ہیں۔

ائمہ کی سیاسی جدوجہد کے نمود و آثار

ان میں سے ایک مسئلہ ''امامت کا ادعا اور اس کی طرف دعوت'' ہے جو ائمہ کی زندگی میں جگہ جگہ نظر آتا ہے اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کا یہی بنیادی محور ہے۔ دراصل یہ ایک مبسوط فصل ہے جس کے ذیل میں مختلف ابواب کے تحت روایات موجود ہیں منجملہ اس کے کافی کی روایت: ''الائمۃ نور اللّٰہ۔۔۔'' امامت کی معرفی کے ذیل میں امام ہشتم کی روایت نیز صادق اہلبیت طہارتؑ سے مروی مختلف روایات اور طرح طرح کے مخالفین سے آپ کے اصحاب کے مجادلے، اس کے علاوہ اہل عراق کو دعوت دیتے ہوئے امام حسینؑ کی زندگی سے متعلق روایات غرضیکہ اس موضوع پر بہت سی روایتیں موجود ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ کی کوششوں اور دعوؤں سے خلفائے وقت کیا سمجھتے تھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے لے کر متوکل عباسی کے دور تک مسلسل طور پر ائمہ کے مقاصد اور منصوبوں کے سلسلہ میں ایک ہی فکر و خیال پایا جاتا ہے۔

ہمیشہ خلفاء اور ان کے عمال و کارندے ائمہ علیہم السلام کو ایک ہی نظر سے دیکھتے رہے اور قہری طور پر ائمہ کے بارہ میں ان کی طرف سے ایک ہی انداز کا فیصلہ صادر ہوتا رہا ہے۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بآسانی اس سے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ ائمہ کے سلسلہ میں ان سب کا ایک ہی نظریہ کیوں ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مثال کے طور پر امام ہفتم موسیٰ ابن جعفرؑ کے سلسلہ میں یہ کہا جانا کہ ''**خلیفتان یجبی الیھما الخراج**۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' یا امام ہشتم علی رضا علیہ السلام کے لیئے یہ جملہ: ''**ھٰذا علی ابنہ قد قعد و ادعی الامر لنفسہ**۔۔۔۔۔۔۔'' یا دیگر ائمہؑ کے بارہ میں اسی قسم کے جملے اس بات کی واضح نشان دہی کرتے ہیں کہ خلفائے وقت اور ان کے رفقائے کار ائمہ کی زندگی سے کس قسم کے دعووں کا استنباط کرتے تھے۔ یہ نہایت ہی قابل توجہ اور اہم ترین نکتہ ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ خلفائے وقت کا اپنی امامت پر اصرار اور شیعیان آل محمدؐ کا اس امر کی نزاکت کے پیش نظر

مسلسل اس کی مخالفت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ جس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: کثیرؔ جو دور بنوامیہ کے پہلے دور کے صف اول کے شعراء (یعنی فرزدقؔ، جریرؔ، اخطل، جمیلؔ اور نصیبؔ وغیرہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے) شیعہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کے عقیدتمندوں میں سے ہے ایک دن امام پنجم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، امام علیہ السلام شکایت کے لہجہ میں اس سے سوال کرتے ہیں: **امتدحت عبد الملک**؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے عبدالملک کی مدح سرائی کی ہے؟! وہ ایک دم گھبرا کر امام سے عرض کرتا ہے: **یابن رسول اللہ ماقلت له** ''**یا امام الهدیٰ**'' اے فرزند رسولؐ میں نے اس کو امام ہدیٰ تو نہیں کہا ہے'' **وانما قلت له اسد والاسد کلب و یا شمس والشمس جماد و یا بحر والبحر موات**۔۔۔۔۔'' ہاں میں نے اس کو شیر، سورج، سمندر، پہاڑ اور اژدہا جیسے خطابات سے ضرور نوازا ہے اور کسی کے لیئے درندہ ہونا یا جماد سے قرار دیا جانا وغیرہ کوئی فضیلت کی بات تو نہیں ہے۔ اس طرح امامؑ کے سامنے کثیرؔ اپنے عمل کی توجیہ پیش کرتا ہے کہ امام کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور تب شاعر آل محمد کمیتؔ اسدی اٹھتا ہے اور اپنا وہ ''قصیدہ ہاشمیہ'' سناتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

من لقلب میتم مستهام غیر ماصبوۃ ولا احلام

یہاں تک کہ وہ اس شعر پر پہنچتا ہے:

ساسة لا لکمن یریٰ رعیة الناس
سواء و رعیة الانعام

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام عبد الملک جیسے کی مدح کے سلسلہ میں کتنے حساس تھے اور دوسری طرف کثیر کے مثل آپ کے دوستوں کی حساسیت ''امام الہدیٰ'' پر مرکوز تھی تو وہ فوراً کہتا ہے کہ مولا! میں نے عبد الملک کو امام الہدیٰ نہیں کہا ہے ـــ اور یہی واقعہ اس بات کی بھی صاف نشان دہی کرتا ہے کہ خلفائے وقت کو اپنے امام الہدیٰ کہے جانے کی کتنی تمنا تھی۔ چنانچہ بنوعباس کے یہاں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لیتا ہے ـــــ مروان ابن ابی حفصه اموی جسکو بنو امیہ اور بنو عباس دونوں درباروں کی غلامی اور مداحی کا فخر حاصل ہے (جی ہاں! یہی تو عجیب چیز ہے یہ شخص بنوامیہ کے زمانہ میں درباری شاعر تھا اور جب بنوعباس برسراقتدار آئے تو ان کا بھی درباری شاعر بن گیا!! چونکہ اس کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی لہٰذا بنوعباس نے بھی اس کو پیسوں کے ذریعہ خرید لیا) چنانچہ جب یہ بنوعباس کی مدح سرائی پر کمر باندھتا ہے تو یہ ان کی شجاعت و کرم جیسی عامیانہ مدح پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کی پیغمبر اسلام کے ساتھ قرابت داری کی بنیاد پر انہیں اس مقام و مرتبہ تک پہونچا دیتا ہے جس کے وہ دیرینہ متمنی تھے۔ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:۔

انی یکون ولیس ذاک بکائن
لبنی البنات وراثة الاعمام

یعنی یہ چیز کیسے ممکن ہے کہ دختر زادے چچا کی میراث کے حقدار بن جائیں؟ کیا کہنا! پیغمبر کے چچا عباس کی میراث نہیں معلوم یہ دختر زادے (اولاد فاطمہؑ) کیوں

ہڑپ کرلینا چاہتے ہیں!!

آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ سارا جھگڑا حق خلافت کے مسئلہ پر ہے اور حقیقتاً یہی سیاسی وثقافتی جنگ رہی ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں مشہور ومعروف شیعہ طائی شاعر، جعفر بن عفان کہتا ہے:۔

لم لا یکون ؟ و ان ذاک لکائن
لبنی البنات وراثة الاعمام
للبنت نصف کامل من ماله
والعم متروک بغیر سهام

یعنی بیٹی اپنے باپ کے نصف مال کی وارث ہوتی ہے اور بیٹی کی موجودگی میں چچا کا مرنے کے والے کے ترکہ میں کچھ بھی حق نہیں ہوتا لہٰذا میراث میں تمہارا حق ہی کیا ہے جو طلب کررہے ہو۔

اس واقعہ سے بھی امامت کے مسئلہ میں شیعیان آل محمدؐ کی حساسیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسئلہ ائمہ علیہم السلام کی طرف سے خونین جدوجہد کی تائید وحمایت ہے جس کا شمار ائمہ کی زندگی سے متعلق گرما گرم بحثوں میں ہوتا ہے اور ائمہ کی سیاسی جدوجہد کی پالیسی کی حکایت کرتا ہے۔مثلاً معلیٰ بن خنیس جس وقت داؤد بن علی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں اس وقت کے امام جعفر صادقؑ کے تاثرات و اظہارات ملاحظہ فرمائیں یا اسی طرح جناب زید شہید، سید الشہداء امام حسین علیہ السلام، شہید فخ نیز بعض دوسرے حضرات کے سلسلہ میں امام علیہ السلام کے ارشادات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ''نور الثقلین'' میں ایک عجیب و غریب روایت دیکھی، یہ روایت علی ابن عقبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:۔

''ان ابی قال دخلت انا والمعلی علی ابی عبدالله (ع) فقال (ع): ابشروا انتم علی احدی الحسنیین شفی الله صدورکم و اذهب غیظ قلوبکم وانالکم من عدوکم وهو قول الله تعالیٰ و یشف صدور قوم مومنین و ان مضیتم قبل ان یروا ذلک مضیتم علیٰ دین الله الذی رضیه لنبیه (ص) ولعلی (ع)''

میں اور معلیٰ ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرتؑ نے فرمایا: تم لوگوں کو بشارت ہو کہ دو میں سے ایک نیک ترین انجام (کامیابی یا شہادت) تمہارا منتظر ہے خداوند عالم نے تمہارے سینوں کو شفا عطا کیا (یا کرے) اور تمہارے دلوں کے غیظ وغضب کو ٹھنڈے کردئے (یا کرے) اور تم کو دشمنوں پر مسلط کردیا (یا کرے) اور یہی وعدۂ الٰہی ہے جو خدا نے (مومنین سے) کیا ہے ''ویشف صدور قوم مومنین''، قبل اس کے کہ یہ کامیابی تمہارے قدم چومے اگر تم دنیا سے رخصت ہوجاتے (یا رخصت ہوجاؤ) تو تمہاری قربانی خدا کے اس دین کے لیئے ہے (یا ہوگی) جس کو پروردگار نے اپنی نبی (محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور علی (علیہ السلام) کے لیئے پسند فرمایا ہے۔

یہ روایت اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جہاد ومبارزہ، کامیابی وکامرانی اور قتل کرنے اور قتل

کردئے جانے کے سلسلہ میں بات کی گئی ہے۔ بالخصوص اس میں معلّیٰ بن خنیس مخاطب ہیں جن کے واقعہ سے ہم سب واقف ہیں۔ امام علیہ السلام بغیر کسی تمہید ومقدمہ کے بات شروع کردیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ امامؑ کسی خاص چیز یا حادثہ سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جبکہ کسی کو حادثہ کا علم نہیں ہے۔ ممکن ہے ''شفی اللہ صدورکم'' تا آخر کی عبارت امام علیہ السلام نے دعا کے طور پر ارشاد فرمائی ہو اور زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ امام کسی پیش آئے ہوئے واقعہ کی خبر دے رہے ہوں تو آیا یہ دونوں حضرات کسی مہم سے واپس ہوئے تھے جس کی حضرت کو خبر تھی یا ہوسکتا ہے کہ خود امامؑ نے ان کو اس مہم پر مامور کیا ہو؟

کچھ بھی ہو حدیث کا لب ولہجہ ان میں سے ہر دو معنی و احتمال کی بنیاد پر واضح طور پر بتاتا ہے کہ امام علیہ السلام اس تیز وتند اور مخاصمت آمیز طریقہ کار کے حامی تھے جو معلّیٰ بن خنیس کی روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے اور یہ چیز بھی توجہ کے قابل ہے کہ معلّیٰ امام صادقؑ کے ''باب'' ہیں اور یہ ''باب'' کی تعبیر خود اپنی جگہ پر ایک مستقل فکر وتحقیق کا موضوع ہے۔

وہ حضرات جو روایات میں ائمہ علیہم السلام کے ''باب'' کے طور پر پیش کئے گئے کون لوگ ہیں؟ جبکہ ان میں سے زیادہ تعداد ان کی ہے جو یا تو مقتول ہیں یا جن کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے؟ مثال کے طور پر یحییٰ بن ام الطویل، معلّیٰ بن خنیس، جابر بن یزید جعفی ۔۔۔۔ وغیرہ

ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے متعلق ایک اور بحث ان کا قید خانوں میں رکھا جانا، گھر سے دربدر کیا جانا اور انھیں زیر نظر رکھا جانا بھی ہے اور میری نظر میں یہ موضوع بہت زیادہ تحقیق وتدقیق کا طالب ہے کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سے مطالب تحقیق و دقت نظر کے محتاج ہیں اور دامن وقت میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ بحث کرسکوں۔

ایک اور مسئلہ خلفا کے مقابلہ میں ائمہ علیہم السلام کا بے خوف وخطر، صاف وصریح بے باک رویہ ہے اور اس بحث کے ذیل میں قابل غور وفکر نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ حضرات بھی معاذ اللہ دبو، مفاہمت پسند اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والے ہوتے تو اپنے دور کے دوسرے علماء وزہاد کی طرح کسی مخالفانہ لب ولہجہ کے بجائے نرم وشیریں انداز کلام کا انتخاب کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے علماء وزہاد موجود تھے جن سے خلفاء نہ صرف علاقہ ومحبت بلکہ ارادت بھی رکھتے تھے۔ ہارون کہتا تھا ؎

کلکم یمشی روید　　کلکم یطلب صید

غیر عمرو بن عبید

یہ لوگ خلفاء کو نصیحتیں بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی ان کو رلاتے بھی ہیں پھر بھی یہ حضرات خلفاء کو ظالم وجابر اور طاغی وغاصب یا شیطان اور اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ذریعہ یاد کرنے سے احتراز واحتیاط برتتے ہیں اس کے برخلاف ائمہ علیہم السلام ایسی کوئی رعایت نہیں کرتے حقائق کا برملا اظہار فرمادیتے ہیں، ارباب حکومت کے ظاہری جاہ و

حشم اور سطوت وہیبت ان کی زبانیں بند نہ کر سکی۔

ایک اور بحث ائمہ علیہم السلام کے ساتھ خلفائے وقت کی معاندانہ روش ہے مثال کے طور پر امام صادقؑ اور منصور کے درمیان نیز امام کاظمؑ اور ہارون کے درمیان جو حادثات وواقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور جن میں سے دو ایک نمونے ہم نے اشارہ کے طور پر ذکر بھی کئے ہیں۔

امامت کی حکمت عملی

ایک دوسری بحث جو پورے طور پر قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہے، ائمہ علیہم السلام کے بے باک دعوے ہیں جن سے امامت کی بنیادی حکمت عملی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں ائمہؑ کے ارشادات ومباحثات میں اس طرح کے دعوے اور بیانات نظر آتے ہیں جو عام انداز سے بالکل مختلف ہیں اور ایک خاص مقصد و راہ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی واقعات سے امامت کی صحیح حکمت عملی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی موارد میں سے ایک وہ موقع ہے جب حضرت موسیٰ

ہارون امام علیہ السلام سے کہتا ہے: **حد فدکا حتی اردھا الیک** فدک کے حدود معین کر دیجئے تا کہ اسے ہم آپ کو واپس کر دیں۔

اس کا خیال تھا کہ اس طرح فدک کا نعرہ جو ہمیشہ تاریخ میں اہلبیت علیہم السلام کی مظلومیت کے عنوان سے دوہرایا جاتا رہا ہے اس کو بے اثر بنادے اور ذریت رسولؐ سے ان کا یہ ہتھیار چھین لے اور شاید اس طرح شیعوں کے ذہنوں میں اپنے اور غاصبین فدک کے درمیان فرق جتانا بھی مقصود رہا ہو چنانچہ حضرتؑ پہلے تو اس کی پیشکش کو رد کر دیتے ہیں اور جب اس کی طرف سے اصرار بڑھتا ہے تو امام علیہ السلام فرماتے ہیں: ''**لا اخذھا الا بحدودھا**'' اگر فدک واپس ہی کرنا ہے تو اس کی واقعی حدود کے ساتھ واپس کرو۔ ہارون قبول کرلیتا ہے تو امامؑ حدود فدک معین فرمانا شروع کر دیتے ہیں:-

''**اما الحد الاول فعدن**'' اس کی پہلی حد، عدن ہے

یہ گفتگو مدینہ یا بغداد میں ہو رہی ہے —امام جزیرۂ عرب کی آخری سرحد عدنؔ کو فدک کی ایک حد کے طور پر معین کر رہے ہیں۔

''**فتغیر وجه الرشید و قال: ایھا**'' ہارون رشید کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے۔ اوہ!

حضرت فرماتے ہیں: ''**والحد الثانی سمرقند**'' اس کی دوسری حد سمرقند ہے۔ مشرق میں ہارون کی سلطنت یہیں منتہی ہوتی تھی۔

''**فاربد وجھه**'' ہارون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔

امامؑ فرماتے ہیں: ''**والحد الثالث افریقیه**'' اور اس کی تیسری حد ٹیونس سے ملتی ہے۔ یہ عباسی حکومت کی مغربی سرحد ہے۔

''**فاسود وجھه و قال: ھیه**'' ہارون کا چہرہ غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے: اچھا؟!! امامؑ اپنی

بات جاری رکھتے ہیں ''**والحد الرابع سیف البحر مما یلی الجزر و ارمینیه**'' اور اس کی چوتھی سمت سمندر کے کناروں سے ملتی ہے جس کی پشت پر جزیرے اور ارمنستان ہیں۔ یہ ملک کا آخری شمالی حصہ ہے۔

اب ہارون کا پارہ آخری نقطہ پر پہونچ چکا تھا کھسیاہٹ اور غصہ کے عالم میں کہتا ہے: **فلم یبقی لنا شئ فتحول الیٰ مجلسی!!** پس ہمارے لیئے کیا بچتا ہے اٹھئے اور میری جگہ بیٹھ جایئے۔قال موسیٰ '**قد اعلمتک اننی ان حددتها لن تردها**'' امامؑ نے فرمایا: میں نے پہلے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے فدک کی حدیں بیان کردیں تو کبھی واپس نہ کرے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ''**فعند ذلک عزم علیٰ قتله**'' یعنی یہی وہ منزل تھی جب ہارون امامؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کرلیتا ہے۔

اس پوری گفتگو میں واضح ترین چیز امام علیہ السلام کا ادعا ہے وہ چیز جس کو ہارون نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قتل پر کمر بستہ ہوگیا۔ اور اسی قبیل کے اظہارات جس سے ائمہ علیہم السلام کے دعووں کا صاف پتہ چلتا ہے امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام رضاؑ کی زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں جن کو اگر یکجا کردیا جائے تو امامت کا موقف واضح طور پر سامنے آجائے۔

ائمہؑ کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں ان کے اصحاب کا نظریہ

ائمہؑ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور مسئلہ جس کی تحقیق اور چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ائمہؑ کے مقاصد ان کے طریقۂ کار اور مدعا کے سلسلہ میں ائمہؑ کے اصحاب کیا نظریہ رکھتے تھے، اس کا جائزہ لیا جائے۔ بدیہی سی بات ہے کہ ہمارے مقابلہ میں اصحاب ائمہؑ ان بزرگواروں سے زیادہ نزدیک بھی تھے اور ان کے مقصد و مدعا سے زیادہ واقف و آگاہ بھی تھے تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے کیا تاثرات تھے اور وہ اس کی کیا تفسیر کرتے تھے؟ کیا روایات سے اس نکتہ کی وضاحت نہیں ہوتی کہ خود اصحاب بھی قیام و خروج کے منتظر تھے؟ خراسان کے اس شخص کی داستان سے کون ناواقف ہے جو امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرتا ہے کہ کئی لاکھ مسلح افراد وارد میدان ہونے کے سلسلہ میں آپ کے اشارہ کے منتظر ہیں۔ جب حضرت مذکورہ اعداد وشمار پر تعجب فرماتے ہیں تو وہ پے در پے اعداد میں کمی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ بات کو ختم کرتے ہوئے امامؑ اپنے اصحاب اور انصار کے اوصاف بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اگر اس طرح کے اتنے (۱۲، ۱۵ یا...... افراد اختلاف روایات کے ساتھ) مجھے میسر ہوتے تو میں میدان میں آجاتا۔

اس طرح کے بہت سے افراد امام کے پاس آکر قیام کا تقاضہ کرتے رہے ہیں (روایات میں خروج کا لفظ استعمال ہوا ہے البتہ بعض موارد میں امامؑ سے قیام کا مطالبہ کرنے والوں میں عباسی حکومت کے جاسوس بھی ملتے ہیں جس کا اندازہ امامؑ کی جانب سے ان کو دئے جانے والے جوابات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے)

آخر یہ افراد امامؑ کی خدمت میں اس قسم کا مطالبہ لے کر کیوں حاضر ہو رہے تھے؟ کیا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ اس وقت شیعوں کے درمیان حق و انصاف پر مبنی حکومت کی تاسیس کے لیئے قیام و خروج ایک حتمی اور ائمہؑ کے مقاصد سے ہم آہنگ امر شمار ہوتا تھا چنانچہ ائمہ علیہم السلام کے اصحاب و انصار میں یہ بات مشہور تھی کہ امامؑ کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ روایت نظر سے گذری جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زرارہ ابن اعین جیسے بلند مرتبہ صحابی بھی اس سلسلہ میں کیا نظریہ رکھتے تھے۔ رجال کشی میں روایت ہے: ایک دن زرارہ امامؑ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص اپنی تلاش میں سرگرم دشمن کے ہاتھوں سے بھاگ نکلا ہے اگر ''یہ امر'' (حکومت کے لیئے قیام) نزدیک ہو تو وہ صبر کرے تا کہ قیام کرنے والوں کے ساتھ خروج کرے اور اگر اس میں تاخیر ہو تو وہ مصالحت کر لے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں: ''وہ وقت آئے گا'' زرارہ سوال کرتے ہیں: کیا ایک سال کے اندر ایسا ہوگا؟ امامؑ فرماتے ہیں: ''انشاء اللہ وہ وقت آئے گا'' زرارہ پھر پوچھتے ہیں: کیا دو سال لگ جائے گا؟ امامؑ اپنا جملہ دہرا دیتے ہیں: ''انشاء اللہ وہ وقت آئے گا'' اور زرارہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ دو سال تک آل علیؑ کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

یقیناً زرارہ سادہ لوح و بے اطلاع افراد میں سے نہ تھے وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے قریب ترین اصحاب میں سے تھے ان کا اس قدر قریب ترین زمانہ میں حکومت علوی کی تشکیل کا اندازہ لگانا ظاہر ہے بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسری روایت میں ہشام ابن سالم نقل کرتے ہیں کہ ایک روز زرارہ نے مجھ سے کہا: **لا تریٰ علیٰ اعوادھا غیر جعفر** (ع) مسند خلافت پر امام جعفرؑ ابن محمدؑ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھو گے۔ ہشام کہتے ہیں جب امام صادقؑ نے شہادت پائی تو میں نے زرارہ سے کہا: ''کیا تم کو اپنی وہ بات یاد ہے؟'' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھول نہ گئے ہوں مگر زرارہ نے کہا: ہاں مگر خدا کی قسم میں نے وہ بات اپنے اندازہ کے مطابق کہی تھی (مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ زرارہ نے وہ بات امام علیہ السلام سے نقل کی تھی)

متعدد روایتوں سے اصحاب ائمہؑ کی طرف سے قیام کی درخواست یا اس کے انتظار کا پتہ چلتا ہے اور اس سے اس بات کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ ائمہ علیہم السلام کا ہدف و مقصد یعنی حکومت علوی کی تشکیل، اس کے لیئے تلاش و جستجو اور اس کا متوقع ہونا شیعیان آل محمدؐ حتیٰ کہ ائمہؑ کے قریب ترین ساتھیوں کے درمیان مسلمات میں شمار ہوتا تھا اور یہ چیز ائمہؑ کے ہدف و حکمت عملی کا ایک قطعی قرینہ ہے۔

ایک دوسری بحث یہ ہے کہ ائمہ کے ساتھ خلفائے وقت کے بغض و عناد اور خصومت و دشمنی کی علت کیا تھی؟ آیا ان کے حسد کی وجہ محض ائمہؑ کی معنوی عظمت اور عوام میں ہر دل عزیزی تھی اور ان تمام دشمنیوں کی اصل بنیاد یہی چیز تھی؟ یا حقیقت امر کچھ اور ہے؟

یقیناً اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ائمہ علیہم السلام خلفاء نیز اس طرح کے دوسرے افراد کے حسد کا نشانہ رہے ہیں کہ جیسا کہ قرآن کی آیت: **ام یحسدون الناس علی ما آتیهم الله من فضله** کی تفسیر کے ذیل میں اس مضمون کی روایت موجود ہے کہ ''**نحن المحسودون**'' یعنی وہ لوگ جن سے لوگوں کا حسد کرنا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ہم لوگ ہیں۔ پھر بھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ ائمہؑ کے ساتھ لوگوں کے حسد کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے علم وتقویٰ سے لوگ حسد کرتے تھے؟ تو یہ سبھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے علماء وزہاد بھی موجود تھے جو انہی صفات کے ساتھ لوگوں میں پہچانے جاتے تھے اور ان کے چاہنے والوں اور دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ابوحنیفہ، ابویوسف، حسن بصری، سفیان ثوری، محمد بن شہاب اور اسی طرح کے دسیوں مشہور و معروف چہرے اس وقت موجود تھے، جن کے بڑی تعداد میں مطیع و خیرخواہ موجود تھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کے درمیان مشہور تھے بلکہ ان کے محبوب بھی تھے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خلفاء نے نہ فقط یہ کہ ان کے ساتھ بغض وحسد کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض خلفا کی محبت وارادت کے مرکز بھی رہے ہیں۔

لہٰذا ہماری نظر میں ائمہؑ کے ساتھ خلفاء کی ایسی شدید دشمنی جو گرفتاری، دربدری، قید وبند اور پھر شہادت پر منتہی ہوتی ہے اس کی اصل علت کسی اور ہی چیز میں تلاش کرنی چاہیے۔ اور وہ خلافت وامامت کے سلسلہ میں ان حضراتؑ کا ادعا ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں نظر آتا۔ یہ ان ہی بحثوں میں سے ایک بحث ہے جس پر تحقیق وتدقیق کئے جانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ایک تحقیق طلب موضوع ائمہ علیہم السلام کے اصحاب کا آستانۂ خلافت کے ساتھ تیز وتند مقابلہ اور ٹکراؤ ہے جس کے نمونے ائمہؑ کی زندگی کے دوران بخوبی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ حضرت سید سجادؑ کے زمانے میں جو سخت خفقان وگھٹن کا دور ہے یحییٰ بن ام طویل جو حضرت کے حوارئین میں سے تھے۔ مسجد مدینہ میں آتے تھے اور ان لوگوں سے جو یا تو دربار خلافت کے سامنے سر تسلیم خم کرچکے تھے یا خلافت کے کارگزاروں میں سے تھے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی وہ آیت پڑھتے تھے جس میں کفار سے جناب ابراہیمؑ کی گفتگو کا ذکر ہے: ''**کفرنا بکم وبدأبیننا وبینکم العداوة والبغضاء...**'' اور اسی طرح کناسۂ کوفہ میں مجمع عام میں شیعوں کے ایک گروہ کو خطاب کرتے ہوئے بآواز بلند ایسی تقریر کرتے ہیں جس کا لفظ لفظ حکام وقت کی سیاست کے لیئے کھلا ہوا چیلنج تھا۔

معلیٰ ابن خنیس نماز عید کی ادائیگی کے لیئے جب لوگوں کے ہمراہ صحرا کی جانب جاتے تھے تو نہایت ہی پریشاں حال غیر مرتب لباس میں غمگین صورت بنائے وہاں پہونچتے تھے اور جیسے ہی خطیب منبر پر جاتا تھا ہاتھوں کو بلند کرکے بآواز بلند کہتے تھے: '' **اللهم ان هذا مقام خلفائک و اصفیائک و موضع امنائک ... ابتزوها** '' پروردگارا! یہ منبر اور یہ مقام تیرے منتخب اور برگزیدہ جانشینوں کا ہے جو فی الحال ان سے چھین لیا گیا ہے

اور دوسروں نے اس پر اپنا پنجہ مضبوط کرلیا ہے۔

اور مقام افسوس ہے کہ یہ بلند مرتبہ صحابی جس کے قاتل پر امام صادق علیہ السلام لعن ونفرین کرتے ہوئے مقتول کی تعریف وتوصیف فرماتے ہیں بعض افراد کی تنقید و بے مہری کا نشانہ بن کر ثقہ اور امین کی فہرست سے خارج کردئے گئے ہیں اور بعید نہیں ہے کہ اس فکر کے پیچھے بھی بنوعباس کا خبیث ہاتھ کارفرما ہو۔

ایک اور مسئلہ جس کے لیئے کافی دقت اور بحث عمیق کی ضرورت ہے، مسئلہ تقیہ ہے۔ اصل میں تقیہ کا مورد اور عنوان سمجھنے کے لیئے لازم ہے کہ وہ تمام روایات جو کتمان و پردہ داری نیز خفیہ سرگرمیوں سے متعلق ہیں ان کی چھان بین کی جائے تا کہ ایک طرف تو ائمہ علیہم السلام کے اس ادعا اور ہدف کے پیش نظر جن کا گذشتہ بحثوں میں ذکر کیا جا چکا ہے اور دوسری طرف خلفائے زمانہ کے اس شدید ردعمل کے پیش نظر جو ائمہ علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی سرگرمی اور سیاسی فعالیت کے خلاف ظاہر ہوتا رہا ہے —— تقیہ کا صحیح اور حقیقی مفہوم سمجھا جا سکے۔

البتہ ایک چیز جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے وہ یہ کہ تقیہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے یا تمام کام اور سعی وکوشش ترک کردینے کا نام نہیں ہے بلکہ پوشیدہ طور پر حفاظت کا خیال رکھتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھنے کو تقیہ کہتے ہیں اور یہ بات بھر پور طور پر، روایتوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی روشن ہو جاتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ سے متعلق ضروری مباحث کا صرف ایک حصہ ہے ان بزرگان دین کی سیاسی زندگی سے مربوط بہت سی دوسری بحثیں بھی ہیں جن کی فہرست پیش کرنے کی بھی اب گنجائش نہیں ہے اگرچہ ان سے متعلق ضروری یادداشتیں میرے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔ بندہ نے ان تمام موضوعات موضوعات پر بڑی تفصیل کے ساتھ کام کیا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس وقت ان تمام چیزوں کو تدوین کرنے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے۔ اے کاش! ایسے باہمت افراد پیدا ہو جاتے جو اس کام کو آگے بڑھاتے اور ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی بھی یکجا صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جاتی اور ہم ان عظیم ہستیوں کی زندگی کے ان تمام روشن پہلوؤں کو اپنے لیے درس اور نمونے کے عنوان سے اختیار کرتے نہ یہ کہ صرف ایک زندہ و پایندہ یادگار کے طور پر اس کا ذکر کرلینا ہی کافی سمجھ لیتے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب علی بن شعیبؓ بن بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا: اے علی! سب سے اچھی زندگی کس کی ہے؟—— میں نے عرض کیا مولا آپ بہتر جانتے ہیں —— اس وقت آپ نے فرمایا: ''جس کی بدولت دوسروں کی زندگی خوشگوار ہو جائے'' اور جانتے ہو زندگی کے لحاظ سے بدترین شخص کون ہے؟ میں نے پھر اپنی لاعلمی ظاہر کی تو آپ نے فرمایا: ''جس کی زندگی میں دوسروں کا کوئی حصہ نہ ہو —— اے علی! جو نعمتیں تمھیں عطا کی گئی ہیں ان کی قدر کرو اور یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، کیونکہ اگر ان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو دوبارہ ملنے کا بہت کم امکان ہے —— اے علی! بدترین شخص وہ ہے جس کی زندگی دوسروں کے لئے مفید نہ ہو۔ جو مہمانوں اور حاجت مندوں کی پروانہ کرتا ہوا کیلا کھاتا ہوا اور اپنے ماتحت پر ظلم کرتا ہو۔

نویں امام

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

نام ونسب: محمد نام، ابوجعفر کنیت اور تقی و جواد دونوں مشہور لقب تھے۔ اسی لیے اسم ولقب کو شریک کر کے آپ امام محمد تقی علیہ السلام کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے پہلے امام محمد باقر علیہ السلام کی کنیت ابوجعفر ہو چکی تھی اس لیے کتابوں میں آپ کو ابوجعفر ثانی اور دوسرے لقب کو سامنے رکھ کر حضرت جواد بھی کہا جاتا ہے۔ والد بزرگوار آپ کے حضرت امام رضاؑ تھے اور والدۂ معظّمہ کا نام جناب سبیکہ یا سکینہ تھا۔

ولادت: ۱۰؍رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت بغداد کے دارالسلطنت میں ہارون رشید کا بیٹا امین تخت حکومت پر تھا۔

نشوونما اور تربیت: یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو نہایت کمسنی ہی کے زمانے میں مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا پڑا۔ انہیں بہت ہی کم اطمینان اور سکون کے لمحات باپ کی محبت، شفقت اور تربیت کے سایے میں زندگی گذارنے کا موقع مل سکا۔ آپ کو صرف پانچواں برس تھا جب حضرت امام رضا علیہ السلام مدینہ سے خراسان کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوئے۔ امام محمد تقی علیہ السلام اس وقت سے جو اپنے باپ سے جدا ہوئے تو پھر زندگی میں ملاقات کا موقع نہ ملا۔ امام محمد تقیؑ سے جدا ہونے کے تیسرے سال امام رضاؑ کی وفات ہو گئی۔ دنیا سمجھتی ہو گی کہ امام محمد تقیؑ کے لیے علمی اور عملی بلندیوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اس لیے اب امام جعفر صادقؑ کی علمی مسند شاید خالی نظر آئے۔ مگر خلق خدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کمسن بچے کو تھوڑے دن بعد مامون کے پہلو میں بیٹھکر بڑے بڑے علماء سے فقہ، حدیث، تفسیر اور کلام پر مناظرے کرتے اور سب کو قائل ہو جاتے دیکھا۔ ان کی حیرت اس وقت تک دور ہونا ممکن نہ تھی جب تک وہ مادی اسباب کے آگے ایک مخصوص خداوندی مدرسہ تعلیم وتربیت کے قائل نہ ہوتے جس کے بغیر یہ معمہ نہ حل ہوا اور نہ کبھی حل ہو سکتا ہے۔

عراق کا پہلا سفر: جب امام رضا علیہ السلام کو مامون نے ولی عہد بنایا اور اس کی سیاست اسکی مقتضی ہوئی کہ بنی عباس کو چھوڑ کر بنی فاطمہ سے روابط قائم کیے جائیں اور اس طرح شیعیان اہل بیتؑ کو اپنی جانب مائل کیا جائے تو اس نے ضرورت محسوس کی کہ خلوص واتحاد کے مظاہرے کے لیے علاوہ اس قدیم رشتے کے جو ہاشمی خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے ہے کچھ جدید رشتوں کی بنیاد بھی قائم کر دی جائے۔

چنانچہ اسی جلسہ میں جہاں ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی اس نے اپنی بہن ام حبیبہ کا عقد امام رضاؑ کے ساتھ کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل کی نسبت کا امام محمد تقیؑ کے ساتھ اعلان کیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ اس طرح امام رضا بالکل اپنے بنائے جاسکیں گے ۔مگر جب اس نے محسوس کیا کہ یہ اپنے ان منصبی فرائض کو جو رسولؐ کے ورثہ دار ہونے کی بنا پر ان کے ذمہ ہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے اور اب عباسی سلطنت کا رکن ہونے کے ساتھ ان اصول پر قائم رہنا مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے تو اسے اپنے مفاد سلطنت کے تحفظ کی خاطر اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ زہر دے کر حضرت کی زندگی کا خاتمہ کردے ۔مگر وہ مصلحت جو امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کی تھی یعنی ایرانی قوم اور جماعت شیعہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا وہ اب بھی باقی تھی اس لیے ایک طرف تو امام رضاؑ کے انتقال پر اس نے غیر معمولی رنج وغم کا اظہار کیا تا کہ وہ اپنے دامن کو حضرت کے خون ناحق سے الگ ثابت کرسکے اور دوسری طرف اس نے اپنے اس اعلان کی تکمیل ضروری سمجھی جو وہ امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کے منسوب کرنے کا کرچکا تھا۔ اس نے اس مقصد سے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے عراق کی طرف بلوایا اس لیے کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد وہ خود خراسان سے اب اپنے خاندان کے پرانے دار السلطنت بغداد میں آچکا تھا اور اس نے یہ تہیہ کرلیا کہ وہ ام الفضل کا عقد اس صاحبزادے کے ساتھ بہت جلد کردے۔

علماء سے مناظرہ: بنی عباس کو مامون کی طرف سے امام رضاؑ کا ولی عہد بنایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا۔ امام رضاؑ کی وفات سے ایک حد تک انہیں اطمینان حاصل ہوا تھا اور انہوں نے مامون سے اپنے حسب دلخواہ اس کے بھائی موتمن کی ولی عہدی کا اعلان بھی کرادیا جو بعد میں معتصم باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے زمانے میں عباسیوں کا مخصوص شعار یعنی کالا لباس ترک ہوکر جو سبز لباس کا رواج ہورہا تھا اسے منسوخ کرکے پھر سیاہ لباس کی پابندی عائد کردی گئی تاکہ بنی عباس کے روایات قدیمہ محفوظ رہیں۔ یہ سب باتیں عباسیوں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ مامون پر پورا قابو پاچکے ہیں مگر اب مامون کا یہ ارادہ کہ وہ امام محمد تقیؑ کو اپنا داماد بنائے ان لوگوں کے لیے پھر تشویش کا باعث بنا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے دلی رجحان کو دل میں نہ رکھ سکے اور ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آکر اپنے جذبات کا اظہار کردیا۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ امام رضاؑ کے ساتھ جو آپ نے طریقہ کار اختیار کیا وہی ہم کو ناپسند تھا مگر خیر وہ کم از کم اپنی عمر واوصاف وکمالات کے لحاظ سے قابل عزت سمجھے بھی جاسکتے تھے مگر یہ ان کے بیٹے محمدؑ تو ابھی بالکل کم سن ہیں ایک بچے کو بڑے بڑے علماء اور معززین پر ترجیح دینا اور اس قدر اس کی عزت کرنا خلیفہ کے لیے زیبا نہیں ہے۔ پھر ام حبیبہ کا نکاح جو امام رضاؑ کے ساتھ کیا گیا تھا اس سے ہم کو کیا فائدہ پہونچا جو اب ام الفضل کا نکاح بھی محمد ابن علیؑ کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

مامون نے اس تمام تقریر کا یہ جواب دیا کہ محمد کمسن ضرور ہیں مگر میں نے خوب اندازہ کرلیا ہے کہ اوصاف

وکمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جن کا تم حوالہ دے رہے ہو علم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو امتحان لے کر دیکھ لو۔ پھر تمہیں بھی میرے فیصلے سے متفق ہونا پڑے گا۔ یہ صرف منصفانہ جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا جس پر مجبوراً ان لوگوں کو مناظرے کی دعوت منظور کرنا پڑی حالانکہ خود مامون تمام سلاطین بنی عباس میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ مورخین اس کے لیے یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں کان **یعد من کبار الفقهاء** یعنی اس کا شمار بڑے فقیہوں میں ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ کچھ کم وقعت نہ رکھتا تھا مگر ان لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ ابن اکثم کو امام محمد تقی علیہ السلام سے بحث کے لیے منتخب کیا۔

مامون نے ایک عظیم الشان جلسہ اس مناظرے کے لیے منعقد کیا اور عام اعلان کروا دیا۔ ہر شخص اس عجیب اور بظاہر غیر متوازی مقابلے کے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا جس میں ایک طرف ایک آٹھ برس کا بچہ تھا اور دوسری طرف ایک آزمودہ کار اور شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر طرف سے خلائق کا ہجوم ہو گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ ارکان دولت اور معززین کے علاوہ اس جلسے میں نو سو کرسیاں فقط علماء وفضلاء کے لیے مخصوص تھیں اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں اس لیے کہ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے شباب اور بالخصوص علمی ترقی کے اعتبار سے زرّین دور تھا اور بغداد دارالسلطنت تھا جہاں تمام اطراف سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کھنچ کر جمع ہو گئے تھے اس اعتبار سے یہ تعداد کسی مبالغہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتی۔

مامون نے حضرت امام محمد تقیؑ کے لیے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی تھی اور حضرت کے سامنے یحییٰ ابن اکثم کے لیے بیٹھنے کی جگہ تھی ہر طرف کامل سناٹا تھا۔ مجمع ہمہ تن چشم و گوش بنا ہوا گفتگو شروع ہونے کے وقت کا منتظر ہی تھا کہ اس خاموشی کو یحییٰ کے اس سوال نے توڑ دیا جو اس نے مامون کی طرف مخاطب ہو کر کیا تھا ''حضور کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ابوجعفرؑ سے کوئی مسئلہ دریافت کروں۔''

مامون نے کہا ''تم کو خود ان سے اجازت طلب کرنا چاہیئے۔''

یحییٰ امام کی طرف متوجہ ہوا اور کہا ''کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ دریافت کروں؟''

فرمایا ''تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو۔''

یحییٰ نے پوچھا کہ ''حالت احرام میں اگر کوئی شخص شکار کرتے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ حضرت امام محمد تقیؑ کی علمی بلندی سے بالکل واقف نہ تھا۔ وہ اپنے غرور علم اور جہالت سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ کم سن صاحبزادے تو ہیں ہی روزمرہ کے روزے نماز کے مسائل سے واقف ہوں تو ہوں مگر حج وغیرہ کے احکام اور حالت احرام میں جن چیزوں کی ممانعت ہے ان کے کفاروں سے بھلا کہاں واقف ہوں گے۔

امامؑ نے اس کے جواب میں اس طرح سوال کے گوشوں کی الگ الگ تحلیل فرمائی جس سے بغیر کوئی جواب

اصل مسئلے کا دیئے ہوئے آپ کے علم کی گہرائیوں کا یحییٰ اور تمام اہل محفل کو اندازہ ہوگیا۔ یحییٰ خود بھی اپنے کو سبک پانے لگا اور تمام مجمع بھی اس کا سبک ہونا محسوس کرنے لگا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مبہم اور مجمل ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شکار حل میں تھا یا حرم میں؟ شکار کرنے والا مسئلے سے واقف تھا یا ناواقف؟ اس نے عمداً اس جانور کو مارڈالا یا دھوکے سے قتل ہوگیا؟ وہ شخص آزاد تھا یا غلام؟ کمسن تھا یا بالغ؟ پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا یا اس کے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا؟ شکار پرندہ کا تھا یا کوئی اور؟ چھوٹا تھا یا بڑا؟ وہ اپنے فعل پر اصرار رکھتا ہے یا پشیمان ہے؟ رات کو یا پوشیدہ طریقہ پر اس نے شکار کیا یا دن دہاڑے اور علانیہ؟ احرام عمرہ کا تھا یا حج کا؟ جب تک یہ تمام تفصیلات نہ بتائے جائیں اس مسئلے کا کوئی ایک معین حکم نہیں بتایا جاسکتا۔

یحییٰ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا بہرحال فقہی مسائل پر کچھ نہ کچھ اس کی نظر بھی تھی وہ ان کثیر التعداد شقوں کے پیدا کرنے ہی سے خوب سمجھ گیا کہ ان کا مقابلہ میرے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی شکستگی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تمام دیکھنے والوں نے اندازہ کرلیا۔ اب اس کی زبان خاموش تھی اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ مامون نے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور حضرت سے عرض کیا کہ پھر آپ ہی ان تمام شقوں کے احکام بیان فرمادیجیے تاکہ ہم سب کو استفادہ کا موقع مل سکے۔ امام نے تفصیل کے ساتھ تمام صورتوں کے جداگانہ جو احکام تھے بیان فرمائے۔ یحییٰ ہکا بکا امام کا منہ دیکھ رہا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ مامون کو بھی کد تھی کہ وہ اتمام حجت کو انتہائی درجے تک پہونچا دے۔ اس لیے اس نے امام سے عرض کیا کہ ''اگر مناسب معلوم ہو تو آپ بھی یحییٰ سے کوئی سوال فرمائیں۔'' حضرت نے اخلاقاً یحییٰ سے دریافت فرمایا کہ ''کیا میں بھی تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں'' یحییٰ اب اپنے متعلق کسی دھوکے میں مبتلا نہ تھا۔ اپنا اور امام کا درجہ اسے خوب معلوم ہو چکا تھا اس لیے طرز گفتگو اس کا اب دوسرا ہی تھا۔ اس نے کہا کہ ''حضور دریافت فرمائیں اگر مجھے معلوم ہوگا تو عرض کردوں گا ورنہ خود حضور ہی سے معلوم کر لوں گا'' حضرت نے سوال کیا جس کے جواب میں یحییٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی عاجزی کا اقرار کیا اور پھر امامؑ نے خود اس سوال کو حل فرمادیا۔ مامون کو اپنی بات کے بالا رہنے کی خوشی تھی۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ:-

''دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ یہ وہ گھرانا ہے جو قدرت کی طرف سے علم کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کے بچوں کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' مجمع میں جوش وخروش تھا سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بیشک جو آپ کی رائے ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور یقینا ابوجعفر محمد ابن علیؑ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ مامون نے اس کے بعد ذرا بھی تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور اسی جلسے میں امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ ام الفضل کا عقد کردیا۔ نکاح کے قبل جو خطبہ ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے وہی ہے جو کہ امام محمد تقیؑ نے اس عقد کے موقع پر اپنی زبان مبارک پر جاری کیا تھا۔ یہی بطور یادگار نکاح کے موقع پر باقی رکھا گیا ہے۔ مامون نے اس شادی کی خوشی میں بڑی

فیاضی سے کام لیا، لاکھوں روپیہ خیر و خیرات میں تقسیم کیا گیا اور تمام رعایا کو انعامات وعطایا کے ساتھ مالا مال کیا گیا۔

مدینہ کی طرف واپسی: شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک امام محمد تقیؑ بغداد میں مقیم رہے اس کے بعد مامون نے بہت اہتمام کے ساتھ ام الفضل کو حضرت کے ساتھ رخصت کر دیا اور امام مدینہ میں واپس تشریف لائے۔

اخلاق و اوصاف: امام محمد تقیؑ اخلاق و اوصاف میں انسانیت کی اس بلندی پر تھے جس کی تکمیل رسولؐ اور آل رسولؐ کا طرۂ امتیاز تھی۔ ہر ایک سے جھک کر ملنا، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا، مساوات اور سادگی کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا، غرباء کی پوشیدہ طور پر خبر لینا، دوستوں کے علاوہ دشمنوں تک سے اچھا سلوک کرتے رہنا، مہمانوں کی خاطر داری میں انہماک اور علمی اور مذہبی پیاسوں کے لیے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپ کی سیرت زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسے اس سلسلۂ عصمت کے دوسرے تمام افراد کا تھا۔

اہل دنیا جو آپ کی بلندی نفس کا پورا اندازہ نہ رکھتے تھے انہیں یہ تصور ضرور ہوتا تھا کہ ایک کمسن بچے کا عظیم الشان مسلمان سلطنت کے شہنشاہ کا داماد ہو جانا یقیناً اس کے چال ڈھال، طور طریقے بدل دے گا اور اس کی زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل جائے گی۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا مقصد ہو سکتا ہے جو مامون کی کوتاہ نگاہ کے سامنے بھی تھا۔ بنی امیہ یا بنی عباس کے بادشاہوں کو آل رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا جتنا ان کے صفات سے۔ وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتے تھے کہ بلندی اخلاق اور معراج انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلے میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے، یہ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ اسی کے لیے گھبرا گھبرا کر وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی اور پھر امام رضاؑ کو ولیعہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ۔ فقط ظاہری شکل وصورت میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا۔ مگر اصل حقیقت دونوں صورتوں کی ایک تھی۔ جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے اسی طرح امام رضاؑ ولیعہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے تو آپ کو زہر کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

اب مامون کے نقطۂ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین تقریباً آٹھ برس کا بچہ ہے جو تین برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا۔ حکومت وقت کی سیاسی سوجھ بوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقے پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومت وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک، قائم ہے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کے ولیعہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب نہیں تصور کرتا تھا۔ اس لیے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی۔ اس میں تبدیلی اگر نہیں ہوئی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ جو آٹھ برس کے سن

سے قصر حکومت میں نشوونما پا کر بڑھیں وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوا ان لوگوں کے جو ان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے اس وقت کا ہر شخص یقیناً مامون ہی کا ہم خیال ہوگا۔ مگر دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا کہ وہ آٹھ برس کا بچہ جسے شہنشاہ اسلام کا داماد بنادیا گیا ہے اس عمر میں اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اصول کا اتنا پابند ہے کہ وہ شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار کردیتا ہے اور اس وقت بھی کہ جب بغداد میں قیام رہتا ہے تو ایک علیٰحدہ مکان بکرایہ لے کر اس میں قیام فرماتے ہیں۔ اس سے بھی امام کی مستحکم قوت ارادی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عموماً مالی اعتبار سے لڑکی والے کچھ بھی بڑا درجہ رکھتے ہوتے ہیں تو وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں وہ رہیں وہیں داماد بھی رہے۔ اس گھر میں نہ سہی تو کم از کم اسی شہر میں قیام رہے۔ مگر امام محمد تقیؑ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مامون کو حجاز واپس جانے کی اجازت پر مجبور کردیا۔ یقیناً یہ امر ایک چاہنے والے باپ اور مامون ایسے بااقتدار کے لیے انتہائی ناگوار تھا مگر اسے لڑکی کی جدائی گوارا کرنا پڑی اور امام مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ڈیوڑھی کا وہی انداز رہا جو اس کے پہلے تھا۔ نہ پہریدار نہ کوئی خاص روک ٹوک، نہ تزک واحتشام نہ اوقات ملاقات، نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤں میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبویؐ میں رہتی تھی جہاں مسلمان حضرت کے وعظ ونصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویان حدیث احادیث دریافت کرتے تھے، طلاب علم مسائل پوچھتے تھے، صاف ظاہر تھا کہ جعفر صادقؑ ہی کا جانشین ہے جو اسی مسند علم پر بیٹھا ہوا ہدایت کا کام انجام دے رہا ہے۔

امور خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں آپ کے بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا ان ہی حدود میں آپ نے ام الفضل کو بھی رکھا۔ آپ نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی کہ آپ کی بیوی ایک شہنشاہ وقت کی بیٹی ہیں۔ چنانچہ ام الفضل کے ہوتے ہوئے آپ نے حضرت عمار یاسر کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ عقد بھی فرمایا اور قدرت کو نسل امامت اسی خاتون سے باقی رکھنا منظور تھی۔ یہی امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ ام الفضل نے اس کی شکایت اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجی۔ مامون کے دل کے لیے بھی یہ کچھ کم تکلیف دہ امر نہ تھا مگر اسے اب اپنے کیے کو نباہنا تھا، اس نے ام الفضل کو جواب لکھا کہ تمہارا عقد ابوجعفرؑ کے ساتھ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان پر کسی حلال خدا کو حرام کر دوں۔ مجھ سے اب اس قسم کی شکایت نہ کرنا۔

یہ جواب دے کر حقیقت میں اس نے اپنی خفت مٹائی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اگر مذہبی حیثیت سے کوئی بااحترام خاتون ہوئی ہے تو اس کی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا گیا۔ جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جناب خدیجہ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کے لیے جناب فاطمہ زہراؑ۔ مگر شہنشاہ دنیا کی بیٹی کو یہ امتیاز دینا صرف اس لیے کہ وہ ایک بادشاہ کی بیٹی

ہے، اسلام کی اس روح کے خلاف تھا جس کے آلِ محمدؑ محافظ تھے۔ اس لیے امام محمد تقیؑ نے اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔

تبلیغ وہدایت: آپ کی تقریر بہت دلکش اور پر تاثیر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ زمانہ حج میں مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہوکر آپ نے احکام شرع کی تبلیغ فرمائی تو بڑے بڑے علماء دم بخود اور دنگ رہ گئے اور انہیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے ایسی جامع تقریر کبھی نہیں سنی۔

امام رضاؑ کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا جو امام موسیٰ کاظمؑ پر توقف کرتا تھا یعنی آپ کے بعد امام رضا علیہ السلام کی امامت کا قائل نہیں تھا اور اس لیے واقفیہ کہلاتا تھا۔ امام محمد تقیؑ نے اپنے دور میں اس گروہ میں ایسی کامیاب تبلیغ فرمائی کہ سب اپنے عقیدے سے تائب ہوگئے اور آپ کے زمانہ ہی میں کوئی ایک شخص ایسا باقی نہ رہ گیا جو اس مسلک کا حامی ہو۔

بہت سے بزرگ مرتبہ علماء نے آپ سے علوم اہلبیتؑ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ایسے مختصر حکیمانہ مقولوں کا بھی ایک ذخیرہ ہے جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے بعد امام محمد تقیؑ کے مقولوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ الٰہیات اور توحید کے متعلق آپ کے بعض بلند پایہ خطبے بھی موجود ہیں۔

عراق کا آخری سفر: ۲۱۸ھ میں مامون نے دنیا کو خیرباد کہا۔ اب مامون کا بھائی اور ام الفضل کا چچا مؤتمن جو امام رضاؑ کے بعد ولی عہد بنایا جاچکا تھا تخت سلطنت پر بیٹھا اور معتصم باللہ عباسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی امام محمد تقیؑ سے متعلق ام الفضل کے اسی طرح کے شکایتی خطوط کی رفتار بڑھ گئی جس طرح کے اس نے اپنے باپ مامون کو بھیجے تھے۔ مامون نے چونکہ تمام بنی عباس کی مخالفتوں کے بعد بھی اپنی لڑکی کا نکاح امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ کر دیا تھا اس لیے اپنی بات کی پچ اور کیے کی لاج رکھنے کی خاطر اس نے ان شکایتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی بلکہ مایوس کردینے والے جواب سے بیٹی کی زبان بند کر دی تھی مگر معتصم کو جو امام رضاؑ کی ولی عہدی کا داغ اپنے سینہ پر اٹھائے ہوئے تھا اور امام محمد تقیؑ کو داماد بنائے جانے سے تمام بنی عباس کے نمایندے کی حیثیت سے پہلے ہی اختلاف کرنے والوں میں پیش پیش رہ چکا تھا۔ اب ام الفضل کے شکایتی خطوں کو اہمیت دے کر اپنے اس اختلاف کو جو اس نکاح سے تھا حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ پھر سب سے زیادہ امام محمد تقیؑ کی علمی مرجعیت، آپ کے اخلاقی اثر کا شہرہ جو حجاز سے بڑھ کر عراق تک پہونچا ہوا تھا، وہ بنائے مخاصمت جو معتصم کے بزرگوں کو امام محمد تقیؑ کے بزرگوں سے رہ چکی تھی، اور پھر اس سیاست کی ناکامی اور منصوبے کی شکست کا محسوس ہوجانا جو اس عقد کا محرک ہوا تھا جس کی تشریح پہلے ہوچکی ہے یہ تمام باتیں تھیں کہ معتصم مخالفت کے لیے آمادہ ہوگیا۔ اپنی سلطنت کے دوسرے ہی سال امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بغداد کی طرف بلوا بھیجا، حاکم مدینہ عبدالملک کو اس بارے میں تاکیدی خط لکھا۔ مجبوراً امام محمد تقیؑ اپنے فرزند امام علی نقیؑ اور ان

بقیہ صفحہ ۳۵ پر

غلبۂ جذبات

حکیم الامت علامۂ ہندی مولانا سید احمد نقوی مجتہد طاب ثراہ

حیات انسانی کے دو مختلف اجزاء ہیں ایک حیات نباتی دوسرے حیات حیوانی۔ انسانی زندگانی کے تمام افعال انہیں دو اصناف پر منقسم ہیں۔ کھانا، پینا، سونا یہ اول الذکر کی مثالیں ہیں۔ چلنا پھرنا اور ادراک سے کام لینا آخر الذکر کے مظاہر ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ علیٰ ترتیب زمانی کے لحاظ سے اول الذکر کو آخر الذکر پر تقدم ہے۔ دیکھو بدل متحلل کی ضرورت، گرمی، سردی کا احساس، خواب کی احتیاج، یہ چیزیں انسان میں ولادت کے ساتھ ہی پیدا ہوجاتی ہیں۔ خلاف اس کے چلنے پھرنے کی قوت اور قوائے مدرکہ سے کام لینے کی قابلیت ایک مدت میں آتی ہے۔ یہ کیفیت صرف جسمانی زندگی کی نہیں بلکہ ذہنی زندگی کی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ شعور کے ابتدائی مدارج میں بھی وہی خصائص نقش ظہور پذیر ہوتے ہیں جس کا تعلق احساس سے ہوتا ہے اور اگر خصائص عقلی ظاہر نہیں ہوئے ہیں تو انہیں احساس خصائص کے تابع و مغلوب رہتے ہیں۔ اسی لیئے تم دیکھتے ہو کہ بچوں، عورتوں، وحشیوں کے جذبات کس قدر قوی ہوتے ہیں اور ان کی عقل ان کے جذبات کے سامنے مغلوب و بے بس رہتی ہے۔ مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کاروبار، ارسطو، فیثاغورث، کے وضع کردہ اصول منطق پر نہیں بلکہ طبعی اور خودرو جذبات کی رو پر چل رہا ہے کائنات کی مشینری جس کمانی سے چل رہی ہے وہ جذبات ہی کی قوت ہے۔ جدھر جذبات کی رفتار ہوتی ہے اسی طرف انسان سے افعال اور اعمال سرزد ہوتے ہیں اور جذبات کی نوعیت پر انسان کی سیرت اور کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے۔ البتہ عقل کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جذبات کے غیر محدود زور وقوت کو ایک حد تک محدود رکھے۔

لہٰذا سیرت انسانی کی کنجی جذبات ہی کے ہاتھ میں ہے اور عقل افسرانہ حیثیت سے ان کی نگراں ہے۔ اور چونکہ عقل ارتقائی حیثیت سے جذبات کے مقابلے میں بہت ہی کم عمر ہے اور خصائص ذہنی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے اس لیئے جہاں شعور اپنے انتہائی نقطۂ کمال سے پست ہوا اور شعور خفی کا دور دورا شروع ہوا وہیں عقل کی باگ فوراً ڈھیلی ہوجاتی ہے اور جذبات تقریباً مطلق العنان ہوجاتے ہیں اور انسان کی حیات نفسی کے ہر شعبے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالت میں کسی کے سامنے اگر چہ وہ جماعت ہی کیوں نہ ہو اس کی عقل کو مخاطب کرنا قطعا بیکار ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا مخالف اثر پڑتا ہے۔ اس لیئے علمبردار ان اصلاح کو لازم ہے کہ جن عقائد و خیالات کی بنیاد تمامتر جذبات پر ہیں ان کی رد میں دلائل و براہین سے کام نہ لیں اس لیئے کہ جوشی عقل کی راہ سے نہیں آتی ہے وہ عقل کے راستے سے نکل ہی نہیں سکتی۔ جماعت کے خیالات و معتقدات جذبات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور

جذبات ہی انہیں ہٹا سکتے ہیں اور اسی طرح سے تعلیم میں ان جذبات کے مٹانے میں بے بس ہے اور اس کا کام قوت فکری کو جلا دینا ہے۔ تعقل قوی ہوجاتا ہے، استنباط مسائل کا بسہولت ہوتا ہے مختصر یہ ہے کہ عقل اور قوی حصہ کے نقش کے کسی اور شعبہ پر تعلیم و تربیت کا کچھ اثر نہیں ہوتا ہے۔ نخاعی قطعات اس کی دسترس سے باہر ہی رہتے ہیں۔ اگر انسانیت کے بالائی اور سطحی پہلو تعلیم سے چمک اٹھتے ہیں لیکن اندرونی اور دقیق خصائص جو اس کی اصل ہستی کا مایۂ خمیر ہوتے ہیں بدستور جوں کے توں رہتے ہیں۔ ارسطو اور افریقہ کے وحشیوں میں یوں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن جہاں تک جذبات طبعی و احساسات جبلی کا تعلق ہے دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

ماحصل تقریر کا یہ ہے کہ عقل اور تعلیم جذبات کی نامحدودی کو صرف روک سکتی ہے، انکو فنا نہیں کرسکتے۔ وہ اعمال اور افعال جن پر حیات انسانی کا اطلاق ہے وہ تین عنوانات کے تحت میں رکھے جاسکتے ہیں۔

۱۔ وہ افعال جو افراد کی صیانت حیات کے لیئے لازمی ہیں جیسے کھانا، پینا، سونا۔

۲۔ دوسرا وہ افعال جن سے نوع یا نسل کی بقا مقصود ہوتی ہے مثلاً تاہل، فرائض زوجیت، اولاد کی پرورش وغیرہ

۳۔ وہ افعال جن سے ہیئت اجتماعیہ کا قیام اور ترقی وابستہ ہے مثلاً اگر ہم حیاتیات (بایالوجی) کے قوانین سے مدد لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ حیات انسانی میں یہ ہرسہ عناصر بلحاظ مدارج اہمیت ایک خاص ترتیب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور انہیں فرائض حیات کے مطابق اور متوازی جذبات ہی نفس انسانی میں ودیعت کیئے گئے ہیں تاکہ ان کے تقاضے سے بے چین ہوکر وہ ان فرائض کو بجالائے۔

انسان میں سب سے زیادہ قوی و غالب وہ جذبات ہیں جن سے ان کی حیات شخصی وابستہ ہے یعنی خود غرضانہ جذبات و خواہشات کا نمبر آتا ہے جن پر ان کی اولاد کا وجود اور زندگی منحصر ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر وہ احساسات ہوتے ہیں جن پر حیات عمرانی مشروط ہے اور یہ ترتیب عین فلسفۂ ارتقا کے مطابق ہے۔

خیال کرو ابتدائی تکویل حیات انسانی میں اگر افراد اپنے وجود کو دنیا کی ہرشی پر مقدم نہ سمجھے اور اگر اپنی زندگی کو ہر چیز پر ترجیح نہ دے تو نتیجہ کیا ہوتا۔ یہ ہوتا کہ تنازع للبقاء میں وہ اپنی پوری حفاظت سے غافل ہوکر فنا ہوجاتے اور اس طرح نہ نسل چل سکتی اور ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوسکتی۔

پس چونکہ فطرت کو نسل انسانی قائم رکھنا مدنظر تھا اس لیئے لامحالہ انسان میں جن جذبات کا سب سے پہلے نشو نما ہوا وہ وہی تھے جن پر اس کے حیات شخصی کا انحصار تھا اور اس کے بعد وہ جن پر ان کی حیات نسلی کا دارومدار تھا۔ اسی طرح چونکہ ہیئت اجتماعیہ ترقی یافتہ صورت میں اس وقت قائم ہوئی جبکہ افراد کا شعور ایک خاص بلند سطح دماغی تک پہنچ چکا تھا اس لیئے جن جذبات پر حیات عمرانی مشروط ہے اس نے سب سے آخر میں نمو پایا۔ پس چونکہ ان مختلف النوع جذبات کے طبقات بہ لحاظ تاریخ تکوین باہم مختلف ہیں اس واسطے اس اختلاف جذبات سے عدل تاریخی کی مطابقت میں ان کی قوت کے مدارج میں مختلف ہیں یعنی جو جذبات

قدیم تر ہیں وہ نظام عصبی میں عمیق ترین طور پر منقش ہو گئے جو جذبات سب سے آخر میں پیدا ہوئے ہیں ان کی قوت ضعیف ترین ہے۔ چنانچہ آج تک جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ بداہتا ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کو سب سے زیادہ اپنی جان عزیز ہوتی ہے، اس کے بعد اولاد پر احباب و شناسا، اور جب ان طبقات میں باہم تصادم ہوتا ہے تو انسان عموماً اسی جذبہ کی پاسداری کرتا ہے جس کے نقوش اس کی فطرت میں سب سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ اولاد کی پرورش و پرادخت کے مصارف کے لیئے احباب کے مال کو ناجائز ذرائع سے اپنے تصرف میں لانا اور قحط کے زمانے میں شدت گرسنگی سے اپنی اولاد کو خود کھا جانا اسی کلیہ کے شواہد ہیں۔

یہ قوانین فطرت خواہ طبعیات وریاضیات کے متعلق ہوں اور خواہ نفسیات کے اٹل ہونے میں جن کے مقابلے میں بڑی سے بڑی انسانی ہستی ایک ذرے کے برابر بھی قوت نہیں رکھتی مثالاً دو ایک نظائر پیش کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ قوانین فطرت بڑی سے بڑی ہستی سے اس طرح کھیلتے ہیں جیسے ایک وحشی اور بربری جاہل سے۔

سقراط یونانی فلسفہ کے نظام دشمن کا آفتاب علم وفضل وزہد واتقا میں مشہور آفاق ہے۔ مورخین متفق اللفظ ہیں کہ ان کا قدم کبھی شاہ رہ اخلاق حسنہ سے باہر نہیں بڑھا ہے لیکن جب ''ایسپیا'' زن بازاری کے گرد اس کے حلقہ بگوشوں کا مجمع نظر آتا ہے تو اسی حلقہ میں سقراط بھی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ''ڈیوٹیما'' زن فاحشہ کی خلوت سرا میں جلوہ گر پائے جاتے ہیں اور کبھی ''الکیابڈس'' خوشرو مرد ساقی کے ہاتھ بیتابانہ جام مئے لے کر دکھائی دیتے ہیں۔

انجیلی مسیح ایک وقت بائیں رخسار پر طمانچہ کھا کر داہنے گال کو بھی سیلی کے لیئے پیش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور دوسرے وقت فرماتے ہیں کہ دو میں صلح کرانے نہیں تلوار چلانے آیا ہوں۔ ایک وقت چوری کی مذمت فرماتے ہیں اور دوسرے وقت کھیتوں کی بالیاں خود ہی شاگردوں کے ساتھ کھاتے نظر آتے ہیں۔ ایک وقت شراب کی ممانعت ہوتی ہے تو دوسرے وقت پانی کے خم پر شراب سازی کا معجزہ دیکھا جاتا ہے۔ اپنی ماں مریم کی یہ کہہ کر تحقیر کی جاتی ہے ''میں کیا جانوں وہ کون ہے''

شری کرشن مہاراج زاہدانہ اولوالعزمی کی زندگی کو دیکھو اور ساتھ ہی نوجوان دوشیزہ لڑکیوں سے عشق و عاشقی کے افسانے تاریخوں میں پڑھو۔ ''گوکل'' کی بودوباش کے زمانہ میں گوالوں کے بچوں کے ساتھ یار باشی اور ''گوپیوں'' کی ہم نشینی و ہم مشربی، اپنے مربی و محسن ''جودھا'' اور نند جی کو ''کنس'' کے قتل کے بعد حکومت ملتے ہی نہایت بے اعتنائی سے مایوس پلٹانا اور تعلیٰ وترفع سے اپنی فرمانبرداری اور بادشاہی جتا کر دیرینہ تعلقات کا خاتمہ کر دینا۔

غرضیکہ ایسے ایسے تلون مزاجی کے کرشموں سے بڑی بڑی ہستیاں خالی نظر نہیں آتیں۔ آج نئی فطرت کے تمام ساز وسامان لیئے بڑی سے بڑی قابل تعظیم ہستی اپنے جذبات کے آگے اسی طرح سے محصور و ناچار نظر آتی ہے جیسے ایک بربری آفریقہ کا وحشی ــــــ!!

جرمنی ساری دنیا کو تہذیب وتمدن کا درس دینے کا مدعی تھا لیکن یہی جرمنی کا قیصر قہر وغضب کا عفریت بن کر

اٹھتا ہے اور 'تورین' کے قدیم کتبخانہ اور واجب الاحترام دارالعلوم کو چشم زدن میں خاکستر بنا دیتا ہے۔ ''ہیگل'' ہمیشہ دنیائے جرمنی کا ''ڈارون'' مانا گیا ہے لیکن جرمن وار میں وہ شمشیر بکف اپنی قوم کو خون میں نہاتے دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ ''پروفیسر ونٹ'' و ''منسٹر برگ'' نے ساری عمر نفسیات کے مباحث میں صرف کر دی لیکن ۱۸۶۴ء میں اپنی تمام قوت لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت میں صرف کر دی۔ ''اناٹول'' فرانس کا انشاء پردازوں کا امام تھا لیکن دوران جنگ میں اس کی انگلیاں بجائے کاغذ وقلم توپ وتفنگ سے کھیلتی رہتی تھیں۔ ہزاروں نظارے اس بات کے ہیں کہ انسان کیسی ہی بزرگ وقابل و عالم ہستی ہو فطرت کے اس قانون کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

اسی اصول فطرت کو دیکھتے ہوئے خلاق عالم کو ایسے نفوس کی ضرورت ناگزیر ہوئی جو مافوق البشر اور قوانین فطرت سے بالکل بے تعلق ہوں۔ اس کی نبوت و رسالت اور اس کی فرع جلیل امارت کو خلاف فطرت انسانی خلق کیا گیا اور ایک گھرانے سے مخصوص کر دیا۔ تاکہ ایک ہی مزاج عقلی کے تحت میں سب نبوتیں ہوں اور مختلف جذبات کے تحت میں رہ کر نبوتوں میں اختلاف نہ ہو جائے۔

اور چونکہ نبوت و رسالت اصلاح عامہ اور جذبہ محبت واشیاء وہیئت اجتماعی کے قیام کی غرض سے قائم کی گئی ہے اس لیئے گروہ انبیاء و مرسلین میں بطور توارث کے ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور نظام عصبی میں ان کی اسی طرح سے عمیق نقوش قائم ہو جاتے ہیں جس طرح سے عام شریعت میں نفس پرستی وخودغرضی اور نسلی اغراض مرتشم ہوتے ہیں اور اسی کا نام عصمت ہے کہ تمام جذبات معدوم ہو کر صرف وہی افعال سرزد ہوں جن سے ہیئت اجتماعی کی حفاظت وبقا ہو۔

چنانچہ ہم اس گروہ مقدس میں سب کی نبوتی زندگی کا جائزہ سردست نہیں لے سکتے۔ ہم اسوقت صرف ایک اس نفس مطمئنہ کو پیش کرتے ہیں جو عالم میں عام بشریت کو چیلنج دیتا ہے اور مافوق البشریت خصائل میں اپنی آپ نظیر ہے۔ جو قدسیوں کا سردار اور کروبیوں کا سرتاج، سرخیل شہدا اور نبوت و رسالت کی کڑی اور ختم نبوت کا سر اعظم ہے یعنی حسین علیہ السلام روحی لہ الفداء

ان کی ولادت سے لے کر شہادت تک ان کے مضبوط کیرکٹر میں کوئی تلون مزاجی ومتضاد بات نہ ملتی ہے نہ ملے گی۔ تفصیل کا قیام نہیں ہے اجمالاً سنو۔

حسین علیہ السلام آغوش مادر میں اپنی شہادت و واقعات وحوادث کربلا سن کر مرنے کے لیئے اس وقت سے تیاری کر رہے ہیں۔ ان کے پالنے والے ان کی افتاد مزاج سے اسی وقت سے باخبر تھے کہ یہ ہمت اور شجاعت کا دیوتا صبر و استقلال ومظلومیت کا پیکر کسی جبر وتشدد کے سامنے اپنے اصول کی حمایت سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے گا۔ یہ وجود محترم حیات شخصی وحیات نسلی کے غلبہ جذبات سے مغلوب نہ ہو کر حیات جامعہ انسانی پر مر مٹنے کا اس کی فطرت کا نقش اول جذبہ بقاء ہیئت اجتماعی ہے۔ اس لیئے تھپک تھپک کر سلانے میں لوریاں صبر و استقلال، شجاعت و مردانگی کی دی جاتی تھیں۔ بچپنے کے رونے اور ضد پر واقعات کربلا یاد دلا کر چپ کیا جاتا تھا۔ بھوک اور پیاس کے وقت یتیم وفقیر کو سامنے کی جو کی روٹی اٹھا کر دی جاتی ہے اور تین تین روز کی بھوک

پیاس کا بچپنے سے عادی بنایا جا رہا ہے اور دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم کرنے کے لیئے ایثار کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔

حسین ان افعال و اعمال سے بے اعتنا ہیں جن پر صیانت نفس موقوف ہے بمقابل دوسروں کی صیانت نفس کے۔ اور خودغرضی و نفس پروری کی کوئی جھلک ان کے افعال میں نہ تھی۔ وہ نفسی و نسلی خواہشات و جذبات کو ہمیشہ نوعی اور قومی مفاد پر نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔

اس پیکر عمل نے بتا دیا کہ اصلاح نوعی کے لیئے جان و مال، اولاد و عزیز و اقارب قربان کر دینے والی چیزیں ہیں اور یہی ان کا صحیح مصرف ہے۔

ہر وقت اور ہر حال میں غیر متبدل رویہ سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ حیات انسانی کے ہر دو عنوانات یعنی صیانت حیات اور بقاء نسل، یہ دونوں ہیئت اجتماعیہ کی بقاو اصلاح و حفاظت کی غرض سے انسان پر عائد کی گئی ہیں۔ وہ مسیح انجیلی کی طرح صلیب پر ''ایلی ایلی ما مستقبانی'' چلا چلا کر مشکل سے جان دینے کو اپنے لیئے عار سمجھتے اور عزیز و اقارب بلکہ ششماہیہ بچہ کو بھی اس ہیبتناک قربان گاہ پر چڑھا کر خوشی و مسرت کی جان دیتے ہیں۔

شری کرشن مہاراج ''پرواسیش'' کے بڑے جاتر میں عیش و نشاط کی داد دیتے ہوئے شراب خواری کی ترنگ میں اپنے قریبی رشتہ داروں اور اپنے دوست ''کوروں'' اور اپنے بے شمار لڑکوں اور پوتوں کو بلوائیوں کی طرح قتل عام کر کے بے گور و کفن نعشوں پر بغیر ایک نگاہ غلط انداز ڈالے ہوئے بھی راہی ہوتے ہیں اور خود بھی سوتے ہیں ایک درخت کے نیچے شکاری کے تیر سے زخمی ہو کر دنیا کو الوداع کرتے ہیں ــــــ!!

مگر حسین علیہ السلام یزید اور اس کے ساتھیوں کی شر خواری و ظلم و استبداد پر احتجاج کرتے ہوئے اور اسکی خودغرضانہ حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیئے اپنے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ کربلا کے چٹیل میدان میں آغشتہ بخاک و خون ہو کر بے گور و کفن تین روز تک پڑے رہے۔

''گوتم بدھ'' اور ''سقراط'' اپنی موت کے وقت وعظ و نصیحت کرتے کرتے جان دیتے ہیں تو حسین روز عاشور اپنے متبعین کو اپنے عمل سے ہر مصیبت کا ابدی علاج بتاتے ہیں۔ بھوک و پیاس کی شدت کا اظہار کرنے پر اصول کی مخالفت اور بیعت یزید کے شیطانی مطالبہ کو لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ ہر ذلت و رسوائی اور بدترین مصائب میں مبتلا ہو کر جان دینے کو اصول کی حفاظت میں ترجیح دیتے ہوئے ''العار اولیٰ من دخول النار'' کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ عار و ننگ کے لیئے جان دیدینا اور رضاء الٰہی کے لیئے موت اور ہر ننگ و عار کو گوارا کر لینا ہی وہ آخری نصیحت ہے جو حسینی زندگی کا ماحصل ہے۔ اور تمام جذبات فاسدہ کا یہی تریاق۔ ہر خوبی کا سرچشمہ اور آخری قطرہ خون کی قوم کو دعوت ہے۔

لہٰذا حسین مظلوم کی صحیح عزاداری و سوگواری اور رونے رلانے میں اگر یہ جذبہ کارفرما نہیں ہے تو بے سود و بے ثمر ہے۔ سچا حسینی وہ ہے کہ خودداری میں مر مٹنے اور خدائے تعالیٰ کی مرضی کی حفاظت میں جان و عزت کچھ بھی عزیز نہ کرے۔

❁❁❁

شجاعت کا فلسفہ

عمادالعلماء علامہ سید محمد رضی طاب ثراہ

انسان کی ان اعلیٰ صفات میں سے جن کی وجہ سے اسے کائنات پر فوقیت حاصل ہے، بلندترین صفت شجاعت ہے۔

شجاعت کے لفظی معنی بہادری کے ہیں لیکن اسلام کے نزدیک بہادری یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت و طاقت کو کمزوروں پر استعمال کیا جائے یا اسے کسی غلط یا نامناسب جگہ پر صرف کیا جائے۔ بہت سے نافہم لوگ اسی بات کو بہادری اور شجاعت سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ اپنی قوت کا مظاہرہ ہو۔ بات بات پہ جھگڑے اور فسادات کئے جائیں، کمزوروں اور ضعیفوں پر قوت آزمائی ہو اور زبردستی دوسروں سے اپنی بات منوائی جائے۔

حقیقت میں اس کا شجاعت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ شجاعت یہ ہے کہ انسان مصیبتوں میں گھر کر اور بڑے سے بڑے خطرے کے سامنے جا کر بھی اپنے دل اور اپنی عقل پر پورا قابو رکھے اور غصہ یا خوف میں کوئی ایسی بات نہ کرے اور کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھے جو دین کے خلاف اور عقل وفہم کے منافی ہو۔ شجاعت درندگی کا نام نہیں ہے جس طرح ایک پھاڑ کھانے والا جانور عقل نہیں رکھتا اور جس کو پا جاتا ہے اس پر حملہ کر بیٹھتا ہے، جس کو دیکھ لیتا ہے اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا سوائے اسکے کہ وہ اپنی خواہش کو پورا کرے اور اپنی طاقت کو استعمال کرے چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ شجاعت نہیں ہے اس کا نام بہادری نہیں ہے، یہ تو حیوانیت ہے۔ ایسا انسان جو اپنی عقل اور سمجھ سے کام نہ لے اور اپنی قوت و طاقت کو ان باتوں میں صرف کرے جن میں ان کو استعمال نہ کرنا چاہیے، ان جانوروں سے بھی بدتر ہے جن کا کام ہی پھاڑ کھانا ہے کیونکہ وہ عقل وفہم نہیں رکھتے اور انسان کے پاس یہ امتیاز اور یہ صفت موجود ہے۔ پھر بھی وہ عقل سے کام نہ لے تو یقیناً وہ جانوروں سے بھی پست تر ہے۔ انسان کو اللہ نے برتری عطا فرمائی ہے، اس کا مقام اور اس کی عزت بلند ہے اور اسے ساری کائنات پر فضیلت ملی ہے تو کیا اس لیے کہ وہ جانوروں سے بدتر ہو جائے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں اس سے سرزد ہونے لگیں جو کسی نافہم اور بے شعور جانور ہی سے ممکن ہو سکتی ہیں۔ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ انسان کی فضیلت اور شرف یہی ہے کہ وہ کسی وقت بھی عقل و ہوش اور فہم و شعور کا دامن نہ چھوڑے اور بڑی سے بڑی آفت و مصیبت کے مقابلہ میں بھی جو کچھ کرے وہ سوچ سمجھ کر، دل پر قابو رکھے۔ ، دماغی توازن نہ کھوئے، استقلال او رہوشمندی سے کام لے۔ تحمل وصبر کو فراموش نہ ہونے دے، نتائج وعواقب نگاہ میں رہیں۔ احکام خدا اور دین و مذہب کی قدریں پیش نظر ہوں، موقع اور محل کو جانتا ہو۔ اپنے فرائض سے آگاہ ہو، دوسروں کے حقوق پر نگاہ رکھتا ہو۔ دل میں خدا کا خوف ہو

اور اس کی عظیم سلطنت اور اقتدار پر یقین ہو، غیبی امداد پر بھروسہ ہو۔ ایسا انسان جس میں یہ صفتیں موجود ہوں وہ شجاع اور بہادر ہوگا۔ بڑی سے بڑی مادی طاقت اس کے دل میں رعب اور خوف نہیں پیدا کرسکتی اور نہ کسی کی کمزوری اور ضعف اسے ظلم وجور اور ایذ رسانی کی طرف دعوت دے سکتا ہے۔ وہ وہی کرے گا جو اس کا احساس فرض اسے بتائے گا اور وہی کہے گا جو عقل وفہم کے نزدیک صحیح اور جائز ہوگا۔

یونیورسٹیوں اور دانشکدوں کی زندگی سے لے کر عوامی گذرگاہوں اور پست ترین اجتماعی و انفرادی حیات کے مرکزوں تک شجاعت کا معیار ایک ہی ہے۔ علمی بحثیں ہوں، مذہبی مناظرے ہوں یا نجی اور ذاتی معاملات ہوں۔ کچھ بھی ہو شجاعت نام ہے عمل اور برداشت کی طاقت کے صحیح استعمال کا، جسمانی قوت کے جائز مصرف کا اور مصائب و آلام اور بڑے سے بڑے خوف اور خطر کے وقت پامردی اور استقلال وجرأت کے اعلیٰ ترین مظاہرہ کا جو عقل واحتیاط کے مطابق ہو۔ حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے'' **اشجع الناس من غلب هواه** '' سب سے زیادہ بہادر انسان وہ ہے جو اپنی خواہش نفس پر غالب آجائے۔ مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات پر آنکھ بند کرکے عمل نہ کرے بلکہ وہی کرے جس کی عقل اجازت دے اور جو خدا کے نزدیک درست وروا ہو۔

شجاعت کی صفت بغیر نفس پر قابو پیدا کئے نہیں حاصل ہوسکتی جس نے اپنے نفس کو قبضہ میں کرلیا وہ بڑا بہادر ہے اور جو خود ہی اپنے نفس کے قابو میں ہوگیا اور اس کا تابع بن گیا اس سے بڑھ کر بودا کوئی دوسرا انسان نہیں ہوسکتا۔ اس لیے شجاعت اس کا نام ہے کہ انسان جس طرح اپنی نجی اور عائلی زندگی کے تمام شعبوں میں کسی وقت بھی اپنے توازن عقلی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اسی طرح اجتماعی حیات کے ہر گوشہ میں اس صفت کو مضبوطی کے ساتھ باقی رکھے۔ عقیدہ اور مذہب کے اظہار کا موقع ہو، سیاسی مقابلے ہوں، جسمانی طاقت کے امتحان ہوں، ملکی انتظامات کے مسائل ہوں، قومی اور ملی امور ہوں، آفات ارضی وسماوی کا مقابلہ ہو یا دشمن کی خوفناک فوجوں کا مقابلہ ہو، ہر میدان حیات اور ہر شعبۂ زندگی میں شجاعت کا یکساں معیار ہے اور وہ یہی کہ صبر وضبط اور عقل و ہوش کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور ہمیشہ نفس پر قابو رہے۔ اس دنیا میں کون سا ایسا انسان ہے جس کی زندگی میں اسے مصائب وآلام کا مقابلہ نہ کرنا پڑا ہو۔ یہی مصیبتیں اور آفتیں انسان کی طاقت صبر اور صفت شجاعت کا مظہر ہوتی ہیں اور ان ہی سے انسان کو آزمایا جاتا ہے۔ بہادر وہ انسان ہے جو اس آزمائش میں پورا اترتا ہے اور بودا وہ ہے جو اس امتحان میں ناکام ہوجاتا ہے اور زندگی کی ان بلندیوں تک پہنچنے سے محروم ہوجاتا ہے جہاں ایک شجاع اور بہادر کا مقام ہے۔ نفس کی خواہش تو وقتی طور پر پوری ہی ہوجاتی ہے، دل کی بھڑاس نکل ہی جاتی ہے، انتقام کی آگ بجھ جاتی ہے، ظلم کی پیاس میں سکون حاصل ہوجاتا ہے، حصول اقتدار کی لگن پوری ہوجاتی ہے۔ جو چاہتا ہے دل وہ سب مل جاتا ہے اور مل سکتا ہے۔ اور نفس امارہ کی ہر ضد پوری ہوجاتی ہے لیکن نہیں ملتی تو انسانیت کی بلندی اور نہیں حاصل ہوتا تو وہ شرف وعزت اور مقام جو اللہ نے بہادروں اور شجاعوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

اللہ کے احکام پر عمل کرنا بہادری ہے۔ مرض ہو، خوف ہو، مصیبتوں کے طوفانی اژدھوں کا سامنا ہو، میدان جنگ ہو یا پھولوں کا بستر ہو، دوستوں کی محفل ہو یا دشمنوں کا نرغہ ہو، خدا کو نہ بھولنا اور اس کے احکام پر سرِ تسلیم خم کیے رہنا شجاعت ہے۔ نیند کا طوفان گھیرے ہوئے ہے، نرم بستروں پر کروٹیں لینے کو دل چاہ رہا ہے مگر آواز اذان کے ساتھ آرام و راحت کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کے لیے اٹھنا اور اس کی بارگاہ میں سربسجود ہوجانا یہ بھی شجاعت ہے۔ اسی طرح جس طرح میدان کارزار میں خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنا اور برستی ہوئی آگ میں بے جگری کے ساتھ ٹھہرنا شجاعت ہے۔ مصائب کے طوفانوں کا جو بہادر ہیں وہ ہنس ہنس کے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پہاڑ کی طرح جمے ہوئے قدم کسی مصیبت کی ٹکر سے جنبش نہیں کھاتے۔ شجاعت وہ صفت ہے جسے دشمن بھی عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور بوداپن وہ مذموم صفت ہے جسے خود دوست بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے شجاعت کی صفت بغیر نفس پر قابو پائے نہیں ملتی، بغیر عقل و ہوش سنبھالے حاصل نہیں ہوتی۔ اور بغیر تحمل و صبر کے نہیں پائی جاتی۔ اس لیے جو صابر نہیں وہ بہادر نہیں، جو نفس پر غالب نہیں وہ شجاع نہیں، جو عقل کی بات نہ کرے وہ شجاع نہیں، جو ادائے فرض میں خواہش نفس کو مقدم کردے اس میں شجاعت نہیں، جس کے پاس تحمل و صبر کی دولت نہ ہو وہ بہادر نہیں ہوسکتا۔

جس طرح اللہ کے احکام پر عمل کرنا اور ہر خواہش نفس کے مقابلے میں اس کو ترجیح دینا شجاعت ہے اسی طرح حقوق عباد کو پورا کرنا اور اس میں خواہش نفس کی مخالفت کرنا بھی شجاعت و بہادری ہے۔ قوی تر انسان کا ایک کمزور فرد کے حق کو مان لینا بہادری ہے اور اس کے حقوق کو پامال کرنا بزدلی ہے۔ ایذ ارسانی کا انتقام لینا جائز سہی لیکن معاف کردینا اور درگذر کرنا بہادر ہے۔

فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ جس نے جرم کو معاف کردیا اور اسکی اصلاح کی اس کی جزا اسے اللہ عطا فرمائے گا۔

یہی شجاعت و بہادری وہ اعلیٰ ترین صفت تھی جس نے مٹھی بھر مسلمانوں کو کرۂ زمین کے ہر حصہ پر پھیلا دیا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی پہلی لڑائی ''بدر'' میں ہوئی۔ ان کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی جن کے مقابلہ میں دشمن کی بڑی بھاری فوج تھی جو ہر طرح کے سامان جنگ سے مسلح تھی مگر مسلمانوں کی اس بے سرو سامان فوج کے پاس جو سب سے بڑا ہتھیار تھا وہ رسولؐ کی تربیت کا شرف تھا اور اسلامی تعلیم کا اسلحہ تھا۔ جس کی مدد سے ان کو فتح حاصل ہوئی اور صرف مکہ کے چند سردار ہی نہیں، اس بہادری کی صفت نے تو ان کے قدموں پر کسریٰ اور خاقان و قیصر کے تاج بھی پھینک دیئے تھے اور مشرق و مغرب میں ان کے اقتدار کے پھریرے اڑنے لگے تھے۔

شجاعت بغیر صبر و تحمل کے نہیں مل سکتی۔ اسلام نے صبر کرنے کی اس طرح تعلیم دی ہے۔ **واصبر علیٰ ما اصابک ان ذلک من عزم الامور** جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو اور بے شک صبر کرنا تو بڑی ہمت کا کام ہے۔ نفسانی خواہشات پر عمل نہ کرنا بہادری ہے اور ان کو حکم خدا اور فیصلۂ عقل پر مقدم کردینا بزدلی ہے۔ جنگ خندق میں

شیر خدا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی تلوار مشہور سردار عمرو بن عبدود کے سر پر لگ چکی ہے اور وہ زمین پر تڑپ رہا ہے آپ اس دشمن خدا کے سینے پر پہنچے اور سر کاٹنا چاہا۔ اسی حالت میں عمرو نے آپ کے چہرۂ مبارک کی طرف تھوک کر بے ادبی کی حضرت امیر المومنین علیؑ فوراً اس کے سینہ پر سے اتر آئے اور جب غصہ کم ہوا تو پھر آگے بڑھے اور اس کا سر جدا فرمایا۔ جب جنگ ختم ہو چکی تو کسی نے سوال کیا کہ آپ نے دشمن کو قابو میں لا کے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب اس نے میری طرف تھوکا تھا تو مجھے غصہ آ گیا تھا اس کی اس حرکت پر اس لیے میں اس کے سینہ پر سے اتر آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو میری اس خدمت دینی میں میرا ذاتی جذبۂ انتقام شریک ہو جائے اور جب وہ غصہ فرو ہو گیا تو میں نے اس کا سر جدا کر دیا۔ اسلام کی ہمارے لیے یہ تعلیم ہے کہ ہم کسی وقت بھی اپنے فرض کے احساس میں نفسانی جذبات کی آمیزش نہ ہونے دیں اور جو کچھ بھی کریں وہ وہی جس کی خدا نے اجازت دی ہو۔

اسلامی تاریخ شجاعت و بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے بہادر اسلاف کے نام انسانی حافظہ سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس سب سے بڑا اسلحہ ہماری تاریخ ہے اور ہمارے بزرگوں کے کارنامے ہیں جو ہماری رگ حیات میں شجاعت کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے اور ان میں کبھی نہ مٹنے والی روح بہادری پھونکتے رہیں گے اور یہ وہ تاریخ کی قدریں ہیں جو ہمارے بچہ بچہ کے ذہن میں ثبت ہیں۔

بقیہ امام محمد تقی علیہ السلام

کی والدہ کو مدینہ میں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔

وفات: بغداد میں تشریف لانے کے بعد تقریباً ایک سال تک معتصم نے بظاہر آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی مگر آپ کا یہاں قیام خود ہی ایک جبری حیثیت رکھتا تھا جسے نظر بندی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اسی خاموش حربے سے جو اکثر اس خاندان کے بزرگوں کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ۲۹ ذی القعدہ ۲۲۰ھ میں زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور اپنے جد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس دفن ہوئے۔ آپ ہی کی شرکت کا لحاظ کر کے عربی قاعدے سے اس شہر کا نام کاظمین (دو کاظم یعنی غصہ کو ضبط کرنے والے) مشہور ہوا ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے لقب کو صراحۃً سامنے رکھا گیا جبکہ موجودہ زمانے میں اسٹیشن کا نام جوادین (دو جواد المعنی فیاض) درج ہے جس میں صراحۃً حضرت امام محمد تقیؑ کے لقب کو ظاہر کیا جا رہا ہے چونکہ آپ کا لقب تقی بھی تھا اور جواد بھی۔

رضوی سید: یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنے سادات رضوی کہلاتے ہیں وہ دراصل تقوی ہیں یعنی حضرت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں۔ اگر حضرت امام رضاؑ کی اولاد امام محمد تقیؑ کے علاوہ کسی اور فرزند کے ذریعے سے بھی ہوتی تو امتیاز کے لیے وہ اپنے کو رضوی کہتی اور امام محمد تقیؑ کی اولاد اپنے کو تقوی کہتی، مگر چونکہ امام رضاؑ کی نسل صرف امام محمد تقیؑ سے چلی اور حضرت امام رضاؑ کی شخصی شہرت سلطنت عباسیہ کے ولی عہد ہونے کی وجہ سے جمہور مسلمین میں بہت ہو چکی تھی اس لیے تمام اولاد کا حضرت امام رضاؑ کی طرف منسوب کر کے تعارف کیا جانے لگا اور رضوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان الدین عند اللّٰہ الاسلام

آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ طاب ثراہ

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں ایمان کے بعد نماز کا مرتبہ پیش کش ناظرین کیا تھا۔آج ہم زکوٰۃ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جس کی اہمیت ہمارے رسول کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ بعض قبائل عرب نے پیغمبرؐ سے صلح کرنے میں یہ شرط پیش کی کہ ہم اسلام اختیار کرلیں گے ہر حکم کی اطاعت کریں گے مگر صرف اتنی خواہش ہے کہ زکوٰۃ سے ہم کو معاف کردیا جائے تو رسول نے ارشاد فرمایا **لا خیر فی دین لاصلوٰۃ فیہ ولا زکوٰۃ** اس دین میں کوئی اچھائی نہیں جس میں نہ نماز ہو اور نہ زکوٰۃ ہو۔ یا تو تم لوگ یہ بھی منظور کرو نہیں تو میں تمہاری طرف خدا کا تیر پھینکوں گا۔لوگوں نے عرض کی کہ خدا کا تیر کون ہے تو آپ نے اپنے بھائی علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا کہ یہ ہے سھم اللہ جو کبھی خطا نہیں کرتا۔علی کا نام سن کر اس قبیلہ والوں کی ہمت پست ہوگئی اور ان لوگوں نے زکوٰۃ دینا بھی منظور کرلی۔بعد نماز جو چیز تمام مسلمانوں پر سب سے پہلے واجب کی گئی وہ زکوٰۃ ہی ہے۔زکوٰۃ نہ دینے والوں کے واسطے قرآن کا وعدہ ہے کہ ان کے خزانے جہنم میں گرم کیے جائیں گے اور اس سے کچھ پیشانیاں داغی جائیں گی اور ارشاد ہوگا کہ اس کا مزہ چکھو یہ وہ ہے جو تم نے جمع کیا تھا۔حدیث کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہ ادا کرے تو اس کی نماز بھی قبول نہ ہوگی۔آپ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے زکوٰۃ نہ دی تو خدا اسکے مال کو ایک اژدہے کی صورت بنا کر اس کی گردن میں لپیٹ دے گا جو برابر اس کا گوشت کھاتا رہے گا یہاں تک کہ حساب و کتاب سے فراغت ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو لوگ زکوٰۃ نہ دیتے تھے ان کو رسول نے اپنی مسجد سے نکال دیا کہ تم زکوٰۃ نہیں دیتے تو ہماری مسجد میں نماز نہ پڑھو۔امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا نہ وہ مومن ہے نہ مسلم ہے۔پھر آپ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کا قتل کردینا حضور امام میں جائز ہے ایک زنائے محصنہ کرنے والا دوسرے زکوٰۃ نہ دینے والا مگر غیبت امامؑ میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جاسکتا البتہ بعد ظہور امام ایسے لوگوں کو قتل کریں گے۔ ارشاد امام ہے کہ جو اپنے مال سے حق خدا نہیں نکالتا اس کا مال باطل میں خرچ ہوجاتا ہے۔اس طرح بہت سے احادیث اور روایات زکوٰۃ کے متعلق ائمہ معصومینؑ سے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کتنی ضروری چیز ہے۔

اس زکوٰۃ کی دو قسمیں ہیں ایک زکوٰۃ فطرہ اور ایک زکوٰۃ مال۔زکوٰۃ فطرہ وہ ہے جو بعد ماہ رمضان یوم عید واجب ہے۔جس نے روزہ رکھا ہو اس پر بھی اور جس نے کسی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہو اس پر بھی واجب ہے۔اور زکوٰۃ مال

اونٹ، بھیڑ، بکری، گائے، بھینس پر واجب ہے اور روپیہ، اشرفی، گندم، جو، رطب اور منقے میں واجب ہے۔

زکوٰۃ میں شرط ہے بالغ ہونا، عاقل ہونا، آزاد ہونا، مالک ہونا، تصرف پر قادر ہونا اور بقدر نصاب ہونا۔ اگر ان شرطوں میں کوئی ایک موجود نہ ہوگی تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ہندوستان میں اونٹ، گائے گویا کہ نہیں ہوتے البتہ گائے، بکری، بھیڑ ہوسکتی ہے وہ بھی شاذ و نادر کیونکہ تیس گائے، بھینس اور چالیس بھیڑ، بکری سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور رطب اور منقی بھی یہاں نہیں البتہ صرف اشرفی اور روپیوں میں زکوٰۃ واجب ہے اس میں بھی مذکورۂ بالا شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ سونا، چاندی ہو اور کم از کم چالیس تولہ ۳ ماشہ کے بقدر روپیہ اور ۵ تولہ ۹ ماشہ کے بقدر اشرفی ہو تو چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا چاہیے۔ بشرطیکہ سال بھر ایک حال سے رکھا رہے اور اس صورت سے ہو کہ مالک جس وقت چاہے صرف کرے۔ غلہ میں صرف گیہوں اور جو میں زکوٰۃ ہے جبکہ خود کاشت کیا ہو یا بٹائی سے غلہ حاصل کیا ہو تو جس وقت غلہ حاصل ہو اسی وقت زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر سنچائی کرے تو بیسواں حصہ واجب ہے اور اگر بارش سے یا سیلاب وغیرہ سے پیدا ہوا ہو تو دسواں حصہ واجب ہے اور اگر دونوں صورتوں سے غلہ پیدا ہو تو پندرہواں حصہ نکالے۔ تعداد نصاب یہ ہے کہ صرف جو یا صرف گندم یا دونوں ملا کر اگر کم از کم ۲۳ من ۷ ۲ سیر پیدا ہو تو اس میں اخراجات کا تخمینہ کر کے نکال لے بقیہ میں سے زکوٰۃ نکالے۔

یہ تقریر تو زکوٰۃ کی اہمیت کے متلق تھی اب ہم کچھ روزے کے متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں۔

روزہ یعنی صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت کر کے کھانا پینا اور تمام روزہ باطل کرنے والی چیزوں کو ترک کرنا واجب تو صرف ماہ رمضان ہی میں ہے مگر ماہ رمضان کے علاوہ جن دنوں میں روزہ حرام ہے یعنی عید، بقرعید اور عاشورہ کے علاوہ جب سنتی روزہ رکھے تو خدا کے نزدیک محبوب ترین عبادت ہے جس کی جزا احادیث میں جنت بتائی گئی ہے۔ یہ روزہ جاڑوں کے ٹھنڈے اور چھوٹے دنوں میں تو کچھ تکلیف دہ نہیں ہوتا البتہ گرمی کے زمانے میں یقیناً اذیت دہ ہوتا ہے۔ مگر خدا کی خوشی کے واسطے اپنے نفس کو روزے کی تکلیف میں مبتلا کرنا ہی تو وہ عبادت ہے جس کے ثواب کی حد نہیں ہے۔ قرآن میں روزے کو صبر کہا گیا ہے اور صابر کے واسطے ارشاد ہے کہ خدا ان کو بے حساب جزا دے گا کسی مقام پر ارشاد ہے کہ میں خود روزے کی جزا دوں گا بعض مقامات پر ارشاد رب العزت ہے کہ میں خود روزے کی جزا ہوں۔ اسی وجہ سے امیر المومنینؑ فرماتے تھے کہ مجھ کو گرمی کا روزہ بہت محبوب ہے اور تمام معصومین سوائے عذر شرعی کے ہر روز روزہ رکھتے تھے۔ روزے کی وجہ قرآن میں یوں بتائی گئی ہے کہ شاید تم روزے کی وجہ سے چند ہی دن تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو قرآن نے اور احادیث نے مسلمانوں کو متقی اور پرہیزگار بنانے کی سب سے زائد کوشش کی ہے کیوں کہ تقوی اور پرہیزگاری ہی وہ صفت ہے کہ جس کے ضمن میں ہر عبادت پر عمل اور ہر گناہ سے بچنے کا ذریعہ حاصل ہوجاتا ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ نہ

عبادت ترک کرے گا نہ کسی بری بات کا مرتکب ہوگا۔ ہر مسلمان زبان سے تو یہ ضرور کہتا ہے کہ ہم خدا سے ڈرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ نوے فیصدی مسلمان خدا سے کچھ بھی خوف نہیں کرتے یا اسکو حاضر و ناظر بھی نہیں جانتے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ کوئی بدکار سے بدکار شخص بھی ہو لیکن اگر وہ کسی سے مثلاً حاکم سے یا استاد سے یا اپنے کسی بزرگ سے ڈرتا ہو اور یہ یقین کرلے کہ وہ حاکم یا استاد اس شخص کو دیکھ رہا ہے تو کبھی کوئی بدکاری نہیں کرتا۔ چور اگر یقین کرلے کہ کوئی پولس والا ہم کو دیکھ رہا ہے تو کبھی چوری نہ کرے گا رعایا کو اگر یقین ہو کہ کوئی حاکم جس کا خوف غالب ہے ہمارا نگراں ہے تو کبھی قانون شکنی نہ کرے گا۔ البتہ جب یہ یقین ہو جائے گا کہ کوئی نہیں دیکھتا یا جو دیکھ رہا ہے اس کا خوف دل میں نہیں ہے تو انسان ہر بدفعلی اور قانون شکنی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ خلفشار میں اہم نکتہ یہی ہے کہ ارکان حکومت کی غفلت، سفارش پر عمل، رشوت ستائی، قومی اور مذہبی جنبہ داری نے رعایا کے دل سے حکام کا خوف یک قلم ختم کر دیا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری بڑی سے بڑی قانون شکنی، جرأت و جسارت پر اول تو حکام توجہ ہی نہ کریں گے اور اگر توجہ بھی کی تو سعی، سفارش، رشوت یا مذہبی جنبہ داری ہم کو بچا دے گی لہٰذا جو قانون شکنی چاہے کرو اور جسقدر بھی آفت مچاؤ کسی سزا کا ڈر نہیں ہے حد یہ ہے کہ قتل و غارت اور آتش زنی کے سے جرموں میں بھی لوگ سزا سے بچ جاتے ہیں اس لئے سیکڑوں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد تو جمہوریت کا ایک پس منظر یہ بھی ہے ہر قانون شکنی کی ہمت افزائی کو کوئی نہ کوئی جماعت ضرور ہوتی ہے جس کے مقابلہ میں ہر جمہوریت کو سر جھکا کر اپنی بے بسی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور رعایا کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔ قانون شکنی اور بدامنی بے خوفی کی وجہ سے عام ہوتی جاتی ہے اور عام ہوتی رہے گی اسی وجہ سے قرآن واحادیث نے اللہ کو حاضر و ناظر جاننے اور اس سے ڈرتے رہنے کی سب سے زائد تعلیم دی ہے جس کا زبردست ذریعہ روزہ ہے۔

قرآن مجید میں روزے کا فائدہ **لعلکم تتقون** سے ظاہر کیا گیا ہے یعنی شاید تم چند ہی دن تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ دراصل خواہشات نفس سے بے قابو ہو جانا ہر برائی کی اصل ہے اور خواہشات نفس کو اپنے قابو میں رکھنا تمام حسن عمل کی بنیاد ہے۔ انسان بھوک سے بے چین ہو کر وہ باتیں کرنے لگتا ہے جو اس کی خودداری بلکہ بعض وقت شان انسانیت کے مناسب نہیں ہوتیں۔ پیاس سے بے قابو ہو جاتا ہے، غصہ سے بے قابو ہو کر وہ حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس کا افسوس عمر بھر ختم نہیں ہوتا مگر خواہشات حیوانی سے بے چین ہو کر ایسی ایسی بدکاریاں کرنے لگتا ہے جو اس کو جانور سے بھی بدتر ثابت کر دیتی ہیں۔ بہت سی برائیوں کے جواز میں اپنی عادتوں کا حیلہ ڈھونڈھتا ہے۔ مگر روزہ وہ عملی تعلیم ہے جس کے قواعد و شرائط اگر پیش نظر رکھے جائیں تو انسان میں ہر وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر جذبہ اور خواہش پر قبضہ اور اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ اگر کہوں تو شاید بے محل نہ ہوگا کہ جس طرح تعلیم کے بعد کامل مہارت حاصل کرنے کے واسطے ٹریننگ کا درجہ قائم کیا گیا ہے اسی طرح شریعت نے بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کی انتہائی تعلیم دینے

کے بعد روزے کو محض علمی حدود تک باقی نہ رکھا بلکہ عملی صورت سے تقویٰ کی راہوں پر لگا دینے کی صورت پیدا کی۔ اسی روزے کے ذریعہ سے انسان کو بھوک، پیاس پر صبر کی عادت پڑتی ہے۔ تمام خواہشات حیوانی قابو میں رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چائے کی عادت ہو یا تمباکو، سگریٹ کی عادت یا حقہ کی ہر عادت چھوڑنا پڑتی ہے اور گویا قدرت کی طرف سے بتایا جاتا ہے کہ عادت سے مجبور ہو جانے کا عذر کوئی معقول عذر نہیں ہے اگر انسان قصد کرے تو عادت چھوڑ بھی سکتا ہے۔ کامل روزہ یہ ہے کہ آنکھ ان چیزوں پر نہ پڑے جن کی ممانعت ہے، کان سے وہ باتیں نہ سنے جو حرام ہیں، زبان سے وہ لفظیں نہ نکلیں جن کی ممانعت ہے، ہاتھ وہ کام نہ کریں جو ناجائز ہیں۔ غصہ نہ کرے، جہاں تک ہو رحم وکرم سے کام لے۔ پس اگر ان باتوں کی ایک ماہ تک عادت ڈال لے تو باقی گیارہ مہینوں میں بھی اس عادت سے کام لینا ممکن اور آسان ہو جائے گا۔

اسی صوم کی وجہ سے انسان کو فقراء ومساکین کے مصائب کی قدر ہوتی ہے اور ان سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے احکام مذہب پر موقوف نہیں انسان کا تجربہ اور عقل خود بتاتی ہے کہ تزکیۂ نفس کے واسطے روزے سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

چنانچہ کئی مرتبہ گاندھی جی نے بھی اپنی غلطیوں پر تزکیہ نفس کے واسطے برت رکھا اور تقریباً ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت سے روزے کی تعلیم موجود ہے انہیں وجوہ کی بناء پر شریعت اسلام نے بھی روزے کی بہت تاکید کی ہے یہاں تک کہ اس کو رکن ایمان قرار دیا ہے روزہ ضروریات دین میں سے ہے جو اس کے واجب ہونے سے انکار کرے وہ اسلام سے خارج ہے۔ معصوم سے ایک شخص نے عرض کی کہ ایک شخص عمداً بلا عذر ماہ رمضان کا روزہ ترک کرتا ہے آپ نے فرمایا کہ اس سے دریافت کرو کہ آیا وہ اپنے کو روزہ ترک کرنے میں گناہ گار سمجھتا ہے یا نہیں اگر کہے کہ وہ اپنے کو گناہگار نہیں سمجھتا (جس کا مطلب ہے کہ وہ روزے کو واجب ہی نہیں سمجھتا تو وہ کافر ہے) تو امام کا فرض ہے کہ اس کو قتل کر دے اور اگر وہ کہے کہ اپنے کو گناہ گار سمجھتا ہے تو اس کو تنبیہ کی جائے گی۔ دوسری حدیث ہے کہ اگر دو مرتبہ امام تنبیہ کر چکا اور کچھ سزا دے چکا اس کے بعد بھی کوئی شخص عمداً بلا عذر کے روزہ ترک کرے تو امامؑ ایسے شخص کو بھی قتل کر دیں گے۔ ایک روزے کے ترک کا کفارہ یہ ہے کہ یا ایک غلام آزاد کرے یا ساٹھ فقراء مومنین کو کھانا کھلائے یا ایک روزے کے عوض میں ساٹھ روزے پے در پے بلا فاصلہ رکھے۔

حضرت فاطمہ صلوات اللہ علیہا اسوۂ جاوید

عماد العلماء علامہ سید علی محمد نقوی مدظلہ

اسلام میں عورت پہلے اپنی نسوانیت اور اپنے عورت پن کا تحفظ کرتی ہے اور اپنی مخصوص ذمہ داریوں یعنی اولاد کی تربیت اور صحیح و سالم نسل کی افزائش فراموش نہیں کرتی، خدمت دین و خدا و انسان، جدو جہد اور کوششیں غرضکہ معاشرہ کے ہر موڑ پر مردوں کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنی برتری، اپنی قدر و منزلت اور اپنا احترام برقرار رکھتی ہے۔

حضرت فاطمہ صلوات اللہ علیہا منارۂ عظمت ہیں اور اسلام کے نسوانی معاشرہ کے لیے لازم ہے کہ ان کے کردار اور ان کے اسلوب کی پیروی کرے۔ اسلام میں عورت کا جو تصور ہے حضرت فاطمہ اس کی مکمل ترین تصویر اور اسلام میں عورت کی جو رفعت و منزلت ہے اس کی کامل مظہر ہیں۔

حضرت فاطمہ عورت ہونے کے باوجود آیۂ تطہیر کی مصداق ہیں، پنجتن کی ایک فرد ہیں جو مباہلہ میں پیغمبر اسلام کے ہمراہ تھیں اور تاریخ اسلام کی چودہ مقدس ترین و عظیم ترین شخصیتوں مس سے ایک ہیں۔ انہوں نے یہ بتا دیا کہ ایک عورت کس طرح روحی، فکری اور نظریاتی ارتقا کی بلندی تک پہنچ سکتی ہے۔ حضرت فاطمہ وہ خاتون ہیں جنھیں اسلام نے تمام انسانوں کے لیے ایک نمونہ اور مثالیہ بنا کر پیش کیا ہے۔

جو عظمت و منزلت جناب فاطمہ پیغمبر اسلام اور تمام مسلمانوں کے نزدیک رکھتی ہیں اسلام میں عورت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

شیعہ سنی تمام روایتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ جناب فاطمہ پیغمبر اسلام کے نزدیک محبوب ترین فرد تھیں اور رسول خدا ان سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ حاکم نے 'مستدرک' میں ثعلبہ سے نقل کیا ہے کہ ''رسول خدا جب بھی سفر یا جنگ سے لوٹتے تھے تو مسجد کے بعد سب سے پہلے جناب فاطمہ کے پاس جاتے تھے'' ابن سعد نے اپنی کتاب 'شرف النبوۃ' میں لکھا ہے کہ پیغمبر نے کہا اے فاطمہ اللہ تعالیٰ تمہارے غصہ سے غضبناک ہوتا ہے اور تمہاری خوشنودی سے خوش ہوتا ہے۔'' کتاب 'استیعاب' میں لکھا ہے کہ عائشہ سے لوگوں نے پوچھا کہ رسول خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟ جواب دیا ''فاطمہ'' اور ترمذی میں اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ پیغمبر نے کہا ''فاطمہ میرے نزدیک محبوب ترین فرد ہیں'' یہ تمام عظمت، اہمیت اور احترام جو جناب فاطمہ کا پیغمبر کے نزدیک تھا یا جو تعلق رسول خدا کو جناب فاطمہ سے تھا اس کی وجہ محض باپ اور بیٹی کا رشتہ ہی نہ تھا۔ کیونکہ پہلی

بات تو یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ایک عام انسان نہ تھے بلکہ ایسے فرد تھے جن کے متعلق قرآن فرماتا ہے ''وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ'' یعنی پیغمبر جو کہتے یا کرتے ہیں مرضی و منشائے الٰہی کے عین مطابق ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک باپ فطری طور پر اپنی بیٹی سے الفت و محبت کرتا ہے نہ کہ اس کا خصوصی احترام۔ اس کی تعظیم کرنا اور اسے ''ام ابیھا'' یعنی باپ کی ماں کہنا اور اعلان کرنا کہ اس کا غصہ خدا کے عتاب کو برانگیختہ کرتا ہے اور اس کی خوشی خدا کو خوش کرتی ہے اس بات پر دال ہے کہ رسول خدا جناب فاطمہ کی عظمت کردار، ان کے فرائض و بلند مقاصد اور ان کی شخصیت معنوی کی وجہ سے ان کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت ہونا فضیلت کو سلب نہیں کرتا بلکہ اگر عورت صاحب فضائل انسانی و معنوی ہے تو مردوں سے زیادہ اس کی عظمت ممکن ہے۔

خود پیغمبر اسلام جب جناب فاطمہ کی اس قدر تعظیم اور احترام کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہر زمانہ اور ہر حصے کے مسلمان جناب سیدہ کے لیے کس قدر عظمت و احترام کے قائل ہوں گے۔ تمام علمائے اسلام نے جناب فاطمہ کی خاک پاک ہونا بھی باعث فخر سمجھا ہے اور انھیں اعجاز قرآن کا ثابت کرنے والا اور پیغمبر اسلام کے دعوے رسالت کی صحت پر گواہ تسلیم کیا ہے کیوں کہ جناب فاطمہ زہرا وہ واحد رشتہ دار ہیں جن کے توسط سے پیغمبر اسلام کی نسل دنیا میں محفوظ ہے۔ قرآن کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور کفر رسوا ہوا۔ کفار اور مشرکین کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام مقطوع النسل ہیں یعنی نسل ان پر ختم ہوگئی ہے جبکہ قرآن حکیم اعلان کرتا ہے کہ ''انا اعطینک الکوثر'' یعنی ہم نے تمہاری نسل کو کثرت عطا کی اور تمہارے تمام دشمن ابتر ہیں۔ اور یہ کوثر رسول خدا کو جناب سیدہ کی صورت میں عطا کی گئی، اس طرح مومنین اور علمائے اسلام کے نزدیک جناب فاطمہ صرف محبوب خدا کی صاحبزادی ہی نہیں ہیں بلکہ اسلامی شخصیتوں میں مقدس ترین شخصیت قرآن ناطق، صحت دعویٔ رسالت کی گواہ اور ثابت کنندۂ اعجاز قرآنی بھی ہیں۔

جناب فاطمہ زہرا اس عظمت روحانی کی حامل ہیں کہ انھیں 'بتول' کہا گیا ہے۔ بتول ایسی خاتون کو کہتے ہیں جس کے رشتے دنیا سے منقطع اور حق سے استوار ہوجاتے ہیں۔ 'مجمع البحار' میں آیا ہے کہ حضرت مریم اور جناب فاطمہ صلوات اللہ علیہا دونوں کو بتول کہتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں مقدس خواتین وہ تھیں جن کے رشتے دنیا سے منقطع ہوکر حق سے استوار ہو چکے تھے۔ حضرت فاطمہ کو مسلمان، صدیقہ، مبارکہ، راضیہ اور مرضیہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں کیوں کہ ان میں سے ہر لقب ان کی عظمت کے کسی نہ کسی رخ کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک طرف تو جہاں فاطمہ زہرا مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ ہیں، ایسی خاتون جیسی اسلام چاہتا ہے۔ ایسی نمونہ خاتون جسے پیغمبر اسلام نے خود اپنے دست مبارک سے سانچہ میں ڈھالا اور اپنی پر التفات تربیت کے زیر سایہ پروان چڑھایا۔ دوسری طرف وہ اسلام میں خواتین کی برتری اور سربلندی کی مظہر بھی ہیں۔

دینی مدارس کی اصلاح!

خطیب انقلاب مولانا حسن ظفر نقوی اجتہادی (کراچی)

ان باایمان اور ذمہ دار اساتذہ سے انتہائی معذرت کے ساتھ کہ جو دیانتداری اور دردمند دل کے ساتھ مستقبل کے علماء کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ باایمان اور باصفا اساتذہ بھی میری اس بات کی تائید کریں گے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح اس مقدس شعبے میں بھی پروفیشنل ازم (کاروباری انداز) گھس آیا ہے۔

بعض مدارس کا یہ حال ہے کہ یہ یہ کچھ لوگوں کی دکانیں ہیں جہاں قوم و مذہب کی خدمت سے زیادہ اپنے اور اپنے آنے والے بچوں کے لیے ٹھکانہ مقصودِ نظر ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسجد اور مدرسہ کو اپنی میراث سمجھ لیا جاتا ہے۔ پیش امام چاہتا ہے کہ میری اولاد قابل ہو یا نہ ہو مسجد کی امامت میرے پاس یا میرے بچوں کے پاس ہی رہنی چاہیے۔ ہمارے بعض بہترین دینی مراکز صرف اس لیے غیر معیاری ہو گئے کہ بزرگ علما کے جانے کے بعد وہاں نااہل افراد قابض ہو گئے۔

سب سے پہلے مدارس کو ذاتی ملکیت کی قید سے باہر نکالا جائے۔ وہ کیسے ہوگا؟

دراصل سارا جھگڑا ان مفادات کا ہے جو مدرسے کے ذریعے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ خمس ہمارے اداروں کی بقا اور ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اسی خمس کا غلط استعمال ہونے لگے تو نہ صرف یہ کہ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ غرباء و فقراء بھی بے آسرا رہ جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس ابتلا اور مذہب سے دوری کے دور میں بھی اربوں کے حساب سے خمس نکالا جاتا ہے۔ خمس پر چند مولویوں اور چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ مال امام مدارس کی اور اجازہ رکھنے والے مولویوں کی نذر ہو جاتا ہے اور سہم سادات کے مستحق سادات کی ایک فیصد تعداد کو بمشکل ان کا حق پہنچ پاتا ہے۔ خمس لیتے وقت تو ساری زندگی کا حساب آپ سے لیا جاتا ہے۔ آج تک ہمارے ملک میں کسی نے وصول کئے جانے والے خمس کا بھی حساب دیا؟ یہ تو ہر شخص کو کہتے سنا ہے کہ ہمارے پاس فلاں فلاں مراجع عظام کی طرف سے خمس لینے کی اجازت ہے لیکن یہ آواز کہیں سے نہیں آتی کہ مستحق افراد خمس کے لئے ہم سے رجوع کریں۔

کیوں؟ کیا صرف ایک عام مومن امام کا جواب دہ ہے علماء نہیں؟ یقیناً علماء کی جواب دہی سب سے زیادہ ہے کاغذ کا ایک پرزہ جسے اجازے کا نام دیا گیا ہے اس پر بھی مرجع تقلید یہی لکھتا ہے کہ انتہائی احتیاط سے مربوط امور میں خرچ کرنے کے بعد اپنی معاشی ضرورت کو بھی صاحب اجازہ پورا کر سکتا ہے۔ بس اس ایک آخری جملے نے مصیبت کر دی۔ اب ایک مولوی کی معاشی ضرورت کیا ہے اس کی کوئی حد بندی نہیں ہے یا تو اس کا کوئی نہ کوئی کروڑوں روپے کا پروجیکٹ ہوتا ہے اور پھر اس پروجیکٹ کے بعد اس کی عیال کی معاشی ضروریات، تو پھر اب ظاہر ہے کہ غریب آدمی کہاں جائے، اس کی ضرورت کون پوری

کرے؟ دوسری طرف کچھ علماء اور ذمہ دار مخیر حضرات غربا اور فقرا کی سرپرستی اور امداد کرتے ہیں تو سارا بوجھ بشمول الزامات اور تہمتوں کے ان کے سر پر آ پڑتا ہے۔ اگر اس خمس کے آنے اور جانے دونوں کا حساب ہونے لگے تو یقینا قوم تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔

لہٰذا اس خمس کو مرکزیت (centralization) حاصل ہونا چاہیے، لینے کا بھی اور دینے کا بھی حساب ہونا چاہیے۔ ضرورت کے مطابق مدرسوں کا قیام ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جہاں دل چاہے، جس کا دل چاہے خمس کی دکان سجا کر اور خمس کا مال سمیٹ کر مدرسہ کھول کر بیٹھ جائے۔ علماء کے وظائف ان کی ضروریات کے مطابق ہوں، تحقیقی مراکز کا قیام ہو جہاں علماء مختلف میدانوں اور موضوعات پر تحقیقاتی خدمات انجام دے سکیں۔ جدید علوم بالخصوص کمپیوٹر، سائنس کے مراکز کا قیام، میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز اور یونیورسٹیز کا قیام، اسپتالوں کا قیام، بیواؤں، یتیموں اور نادار انسانوں کی سرپرستی، قوم کے بچوں کو لازمی طور پر تعلیمی زیور سے آراستہ کرانا، اسیروں کی دیکھ بھال، کون سا مسئلہ ایسا ہے جو ہم خمس کے ذریعے حل نہیں کر سکتے مگر اس کا صحیح استعمال تو ہو۔ میں اس فکر میں تنہا نہیں ہوں بلکہ بعض بزرگ علماء بھی میری اس فکر کی تائید کرتے ہیں۔

بظاہر میری بات نئی اور عجیب لگے گی مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں یہ ساری قوم کی آواز ہوگی۔ جس طرح خمس نکلوانے کے لئے لوگوں کو تبلیغ اور ترغیب دی جاتی ہے بالکل اسی طرح خمس وصول کرنے والوں کو بھی پابند کرنا پڑے گا کہ وہ خود ہی سالانہ وصول کئے گئے خمس کا حساب شائع کریں۔ یہی خمس کی غیر منصفانہ تقسیم اداروں اور افراد میں رسہ کشی کا باعث ہی نہیں بن رہی بلکہ درباری ملاؤں کی پیداوار میں مسلسل اضافے کا باعث بھی بن رہی ہے۔ کیونکہ یہی مال و زر علماء کو سرمایہ داروں کے در کا گدا بنا دیتا ہے اور عوام کو علماء کے در کا (عوام کو علماء کے در کا گدا ضرور ہونا چاہیے مگر اس انداز سے نہیں جو مال حاصل کرنے کے لیے اپنایا جاتا ہے)

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس دین کے سچے اور مخلص محافظوں کی پرورش کریں تو ہمیں مدارس کے نظام میں بھی کچھ تبدیلی کرنا ہوگی، تمام مدارس میں ایک درسی نظام قائم کرنا ہوگا۔ مدرسے میں داخلہ لینے والے طلباء کا ایک معیار قائم کرنا ہوگا، علاقائی ضرورت کے مطابق مدارس قائم کرنے ہوں گے۔ اس مدرسہ کا کوئی مالک نہیں بلکہ منتظم اعلیٰ ہو جس کی مدت مقرر ہونا چاہیے۔ یہ منتظم کا منصب ورثہ میں نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ملنا چاہیے اور اس اہلیت کا فیصلہ علماء کا ایک بورڈ کرے۔ تمام شہروں میں مدارس کے قیام کے بعد کسی ایک شہر میں ایک ''علمی شہر'' جسے یونیورسٹی کہیے یا حوزہ علمیہ کہیے دینی طلاب کی اعلیٰ تعلیم یعنی اجتہاد کے لئے ہونا چاہیے۔

ضروری نہیں کہ سارے طلاب دوسرے ممالک میں پڑھنے کے لئے جائیں اور نہ ہی آج کے دور میں یہ ممکن ہے کہ یہاں کے سارے طلاب کو دوسری جگہوں پر داخلے مل جائیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے دوسرے ممالک سے قابل اساتذہ کو بلایا جائے۔ آخر نصف صدی پہلے تک برصغیر میں اجتہاد ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن جب ہمارے مدارس کی سوچ ہی محدود ہو ان میں خود ہی آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو اور استاد اس بات سے ڈرتا ہو کہ شاگرد کہیں مجھ سے آگے نہ نکل جائے تو پھر ایسے مدارس سے توقعات فضول ہیں۔ وہ معاشرے کو مسائل کے بوجھ سے تو کیا آزاد کراتے ہیں بلکہ خود معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

ماں

جناب سید محمد یوسف صاحب

ماں — محور ماحول لطیف، ستون کاشانۂ حیات زیب و زینت خانہ، مرکز امید و آرزو۔ جس کی ممتا لامحدود، جس کی محبت قید و بند سے آزاد۔ **ماں!** جس کا انداز پرورش بچے کے عمدہ کردار کا ضامن، جس کا سایہ بچے کی زندگی کی رونق اور جس سے محرومی زندگی کے لئے قید خانہ۔ جو خود مصیبتیں جھیل کر بچوں کو پالتی ہے، خود تکالیف اٹھا کر بچوں کو راحت پہنچاتی ہے، خود مصائب و کشمکش حیات کا مقابلہ کر کے بچے کو حیات نو بخشتی ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔

ماں — جو اپنی تمناؤں کا جنازہ نکال کر بچوں کی تمنا پوری کرتی ہے۔ اپنی آرزوؤں کی قربانی دے کر بچوں کے گلشن آرزو کو پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ جس کو بچوں کی خاطر خوشی سے جان دینا گوارا۔ جو خود پتھریلی، کھردری اور ریتیلی زمین پر لیٹ کر بچوں کو اپنے گداز جسم پر لٹا کر اور لوریاں سنا کر نیند کے آغوش میں دیدیتی ہے۔ جس کی آنکھیں بچے کو خوش اور بشاش دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں اور وہی آنکھیں بچے کو مبتلائے غم دیکھ کر آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔ جس کی جستجو: ''میرا بچہ بڑا ہو کر سماج میں ایک معزز شخصیت کا مالک بنے'' جس کی آرزو: ''میرا بچہ پھلے پھولے اور بڑھے''

ماں — جو بچے کی ابدی حیات کی طالب رہتی ہے۔ وقت اجل بھی جس کے خشک لبوں پر یہی الفاظ جاری رہتے ہیں ''پالنے والے! میرے بچے دشمنوں سے دور، حوادث سے محفوظ اور زنجیر بیماری سے آزاد رہیں۔ یا رحمٰن، یا رحیم! میرا یہ ادنیٰ سا گلشن جس کو میں نے خون سے سینچا ہے، سدا سرسبز و شاداب رہے۔ یہ پنجۂ خزاں سے دور رہے۔ اے مالک حقیقی! اگر ان پر کوئی افتاد پڑتی، مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹتا یا کوئی ناخوشگوار واقعہ کا خدشہ بھی لاحق ہوتا تو میں تیرا نام لے کر اپنی چادر میں ان کو چھپا لیتی تھی۔ ان کو اپنے سینہ سے لگا لیتی تھی۔ تیری عطا کی ہوئی طاقت ان کی حفاظت میں صرف کر دیتی تھی۔ لیکن آج تو اپنی مشیت و مصلحت سے ان کی اس پناہ گاہ کو ان سے چھین رہا ہے۔ اے پروردگار! میں تیری اس امانت کو جس کی نگہداشت کے لئے تو نے پیمانۂ دل کو محبت و الفت سے لبریز کر کے رتبۂ مادری عطا کیا تھا اور کچھ امانتیں پرورش و تربیت کے لئے دی تھیں انھیں آج اب تیری ہی حفاظت میں چھوڑ کر واپس آ رہی ہوں لیکن ایک دلی خواہش کے ساتھ ''اے کاش! یہ مرقع سدا بہار رہے، تیرا کرم ہمیشہ سایہ فگن رہے۔'' بوڑھی، غمزدہ اور بھاری بھاری پلکیں دو ستاروں کو جن کی روشنی مدھم ہو چکی ہوتی ہے ڈھانپ لیتی ہیں۔ بند ہوتی ہوئی آنکھیں بچوں کو بھی ایک پیغام دیتی ہیں ''بچو! میں نے تم سب کو اللہ کو سونپا۔ تم سب کا اللہ نگہبان ہے۔ دیکھو — میرا سب سے پہلا سبق یاد ہے نا — لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ جیسے کہہ رہے ہوں اب آخر وقت پھر سن لو پیاری شریعت کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا کبھی گمراہ نہ ہوگے۔''

ماں — جس کو آخر دم تک بچے کی بھلائی کی فکر رہتی ہے، سماج کی بھی وہ مایہ ناز اور جلیل القدر ہستی ہے جس کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اگر بچے کی ولادت کے بعد اس ایک شئے کے

بدلے سونے کا ڈھیر دے دیا جائے تو جیسے ایک کھلا ہوا اور مہکتا گل چھین کر کاغذ کا پھول دے دیا ہو۔ جیسے صیاد نے بلبل سے باغ وگل چھین کر اس کو ایک قفس میں بند کر دیا ہو جس میں اب اس کو باقی عمر بسر کرنی ہو یا کسی عروس نو کو جڑاؤ زیورات دے کر اس کی تمناؤں کا خون کر دیا ہو اور ولولوں کو کچل دیا ہو۔

زمانۂ رسالت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن جبکہ آفتاب اپنی مسافت ختم کر رہا تھا، اس کی تمازت کافی کم ہو چکی تھی، اس کی سنہری کرنیں زمین پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ آفتاب نبوت اپنے چند اصحاب کے جھرمٹ میں ضوفشاں ایک مسافت طے کر رہا تھا۔ محبوب سبحانی کے چہرے سے نور ہویدا تھا جیسے زمین پر چاند اتر آیا ہو۔ ساکت آسمان صاحب معراج کے قدموں پر نظر جمائے تھا اور زمین کو فخر تھا کہ صاحب مکارم الاخلاق اس کے سینہ پر قدم رنجہ ہیں۔

رسول کریمؐ کا گزر ایک قبرستان سے ہو رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا کارواں آگے بڑھ رہا ہے اور گرد کارواں کسی واقعہ کی خبر رسانی کر رہی ہے۔ دفعتاً میر کارواں کے قدم رکے اور صحابہ کی استفسارانہ نگاہیں رسولؐ کے چہرے پر جم گئیں۔

سب کی نگاہوں نے رسالت مآب کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دور ایک قبر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے جا ٹکرائیں۔ ہاں دھواں سیاہ، اشک آور اور خطرناک دھواں۔

''مولا یہ دھواں کیسا ہے؟ — عذاب کا نتیجہ — عذاب —— ہاں —

اور یہ چار حروف نے ایک ہیجان برپا کر دیا۔

یہ کس کی قبر ہے— ؟—— ایک ضعیفہ کے پسر کی —— اس کے گھر سے واقف ہو—— ؟—— جی ہاں ——

اس ضعیفہ کو بلاؤ —— لبیک—— یارسول اللہ

کچھ دیر بعد جب ضعیفہ آئی تو اس کی مغموم و ضعیف آنکھیں قبر سے آشکار دھوئیں کو برداشت نہ کر سکیں۔

''مولا—— دھواں — یہ تو میرے بیٹے کی قبر سے نکل رہا ہے —— ہاں—— عذاب کا نتیجہ ہے —

رسول مقبولؐ نے اپنی عبا کا دامن قبر پر ڈال دیا۔ ضعیفہ نے جھک کر دیکھا—— کرب و بے چینی میں مبتلا پسر ۔ یا رحمۃ للعالمین! — اس کے حق میں دعا فرمائیں ——کیا اس نے تیرے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا تھا؟—— ''عمر میں ایک مرتبہ —— صرف ایک مرتبہ —— میرے ہاتھ کو طیش میں جھٹکا تھا'' —— یہ اسی کا لازمی نتیجہ ہے ——!!'' اس کو بچایئے مولا—— اس کے حق میں دعائے مغفرت کیجئے'' —— پہلے تو ماں کی حیثیت سے اس کے فعل کو معاف کر!

ماںتا جوش میں آئی، ضعیفہ نے نیلگوں آسمان کے نیچے دونوں ہاتھ بلند کئے، اشک آلود نگاہیں اوپر کو اٹھیں اور لبوں نے جنبش کی:

''اے رب العالمین! میں نے اس کو معاف کیا۔ اے قادر مطلق! میں تیری بارگاہ میں اس کی مغفرت کی طالب ہوں۔''

رحمۃ للعالمینؐ کے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں بلند ہوئے — نگاہیں آسمان سے ٹکرائیں —— محبوبؐ نے خواہش ظاہر کی اور قادر مطلق نے فوراً دعا مستجاب کی —— دھواں جیسے اس قبر سے اٹھا ہی نہ تھا۔

یہ ہے ماں کا مرتبہ—— اب ذرا اپنے قلب کی گہرائیوں میں دیکھئے کہ ہمیں ماں کے مراتب کا کتنا احساس ہے ہمیں اس کا کتنا لحاظ ہے۔ کاش! اس میں اضافہ ہوتا رہے۔

ہم پنجگانہ نمازیں تین وقت میں کیوں پڑھتے ہیں؟

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی، آیت اللہ جعفر سبحانی مدظلہما العالی

سوال:-اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ''ظہر اور عصر'' یا ''مغرب اور عشاء'' کی نمازیں ملا کر اور ایک وقت میں ادا کرتے ہیں جب کہ ان نمازوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص وقت ہے اور اسلام کے بزرگ پیشوا ان میں سے ہر نماز کو اس کے اپنے وقت پر یعنی پنجگانہ نمازوں کو پانچ وقت میں پڑھا کرتے تھے؟

جواب:-اس امر میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ نماز کا پانچ وقت قائم کرنا اور ہر نماز اس کے فضیلت کے وقت میں ادا کرنا رسول اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ اور صدر اسلام کے عام مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے اور وہ عموماً پانچ نمازیں پانچ وقت میں پڑھا کرتے تھے۔

اس معاملے میں کوئی کلام نہیں لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا ''تفریق'' اور دو نمازوں کے درمیان فاصلہ رکھنا واجب ہے (جیسا کہ اہل سنت کے بہت سے فقہاء قائل ہیں) یا یہ ایک مستحب کام ہے اور کیا دوسرے مستحبات کی طرح جنھیں انجام دینے یا ترک کرنے میں انسان مختار ہے، وہ نمازیں بھی ملا کر یا علیحدہ علیحدہ پڑھنے پر مجبور نہیں خواہ ان کا علیحدہ علیحدہ پڑھنا بہتر ہی کیوں نہ ہو؟

شیعہ علماء نے ان احادیث کی پیروی کرتے ہوئے جن سے رسول اکرمؐ کے عمل کا پتا چلتا ہے اور ان روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ائمہ اہلبیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں اور آیات قرآنی کے ظواہر پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تمام اسلامی ادوار میں نمازوں کے درمیان تفریق کو مستحب سمجھا ہے اور لوگوں کو بتایا ہے کہ نمازوں کے درمیان فاصلہ رکھنا اور ہر نماز اس کے فضیلت کے وقت میں ادا کرنا مستحب اور افضل ہے لیکن اس کے باوجود اس مستحب کو ترک کیا جاسکتا ہے اور مستحب کے معنی بھی یہی ہیں۔

بلاشبہ دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان میں سے ایک نماز کو دوسری کے وقت میں پڑھتے ہیں مثلاً اگر ہم مغرب اور عشاء کی نماز رات کے پہلے حصے میں پڑھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عشاء کو اس کے صحیح وقت کے علاوہ کسی وقت میں بجالائے ہیں بلکہ ہم نے دونوں نمازیں ان کے مشترک وقت میں پڑھی ہیں کیونکہ مغرب کے آغاز سے آدھی رات تک دونوں نمازوں کا وقت شروع ہوجاتا ہے (بجز اس کے کہ مغرب کی ابتداءً تین رکعتیں پڑھنے کا وقت نماز مغرب کے لیے اور آخر سے اندازاً چار

رکعت پڑھنے کا وقت عشاء کے لیے مخصوص ہے اور باقیماندہ وقت دونوں نمازوں کے مابین مشترک ہے)اور ہم جب بھی عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر یعنی اول شب میں یا مغرب کو آخر وقت میں نماز عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھیں دونوں نمازیں ان کے اپنے وقت میں ادا کرتے ہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ نمازی مغرب کو رات پڑتے ہی اور نماز عشاء کو زوال شفق کے بعد بجالائے اور اگر کوئی شخص اس شرط کی رعایت نہ کرے تو وہ فقط ایک مستحب کو ترک کرتا ہے۔

دو نمازیں ملا کر پڑھنا کیوں جائز ہے؟

دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے جواز کے لیے ہماری دلیل اور گواہ وہ حدیثیں ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں اور جنھیں مرحوم شیخ حر عاملی نے اپنی کتاب (وسائل الشیعہ، کتاب صلوٰۃ کے نمازوں کے وقت سے متعلق ابواب [باب ۳۲ اور ۳۳]) میں جمع کیا ہے۔

تاہم یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ فقط شیعہ محدثین نے ہی یہ احادیث نقل نہیں کیں بلکہ اہل سنت کے محدثین نے بھی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے جواز کے بارے میں (حتیٰ کہ ایسے مواقع پر جب کوئی عذر بھی درپیش نہ ہو) رسول اکرمؐ سے روایت نقل کی ہیں اور اپنی معتبر کتابوں میں ابن عباس، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر سے مروی تقریباً دس ایسی روایات کا ذکر کیا ہے جن کی تمام جزئیات نقل کرنے کے گنجائش نہیں ہے اور ہم ان میں سے فقط چند ایک کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ دنیائے اہل سنت کے معروف محدث احمد بن حنبل اپنی مشہور کتاب میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

''صلی رسول اللہ (ص) الظهر والعصر جمیعاً والمغرب والعشاء جمیعاً من غیر خوف ولا سفر'' (مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۲۲۱)

یعنی رسول اکرمؐ ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء، دشمن کے خوف یا سفر جیسے عذر کے بغیر باہم ملا کر بجالائے۔

۲۔ پھر یہی محدث جابر بن زید کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ:

''میں رسول اکرمؐ کے ساتھ نماز ظہر و عصر کی آٹھ رکعتیں اور نماز مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ملا کر بجالایا ہوں۔'' اور یہ حدیث ابن عباس سے مختلف عبارتوں میں نقل کی گئی ہے۔

۳۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کتاب میں عبداللہ شقیق سے نقل کرتے ہیں کہ:

''ایک دن ابن عباس لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے اور ان کی تقریر نے اتنا طول کھینچا کہ ستارے آسمان پر نمودار ہوگئے۔ بنی تمیم کے ایک شخص نے اٹھ کر اعتراض کے طور پر کہا:

الصلوٰۃ والصلوٰۃ

یعنی اب نماز مغرب کا وقت ہے اور اگر تقریر جاری رہی تو اس کا وقت ختم ہوجائے گا۔

ابن عباس نے اس شخص سے کہا:

''میں رسول اکرمؐ کی سنت اور روش سے تم سے

زیادہ واقف ہوں۔ میں نے دیکھ رکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے ظہر اور عصر کی نماز اور اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں ملا کر پڑھی ہیں۔''

راوی کہتا ہے کہ مجھے اس بارے میں شک ہوا اور میں نے اس معاملے کا ذکر ابوہریرہ سے کیا۔ اس نے ابن عباس کے قول کی تصدیق کی۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۲۵ کتاب موطا مالک کے شارح زرقانی نے اپنی شرح میں اس سے ملتا جلتا مضمون جلد ا صفحہ ۲۶۳ پر درج کیا ہے۔)

۴۔ مشہور محدث مسلم بن الحجاج القشیری (متوفی ۲۶۱ ہجری قمری) نے اپنی صحیح میں ''جمع نماز در حضر'' (حضر میں نمازوں کا ملا کر پڑھنا) کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں اس موضوع پر چار روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے تین ابن عباس پر اور ایک معاذ بن جبل پر ختم ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۱) ان چار حدیثوں کا مضمون بھی جو کچھ اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے مطابق ہے اور ان روایات میں ایک نئے نکتے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب راوی ان نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ:

''ارادان لایحرج امتہ''

یعنی آپ اپنی امت کو زحمت اور مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

یہ وجہ شیعہ روایات میں بھی وارد ہوئی ہے اور اس باب میں جو روایات امام صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں ان میں بھی یہ نکتہ موجود ہے۔ (وسائل الشیعہ کتاب صلوٰۃ ابواب وقت باب ۳۲، احادیث ۲، ۳، ۴، ۷)

اس مسئلے (یعنی دو نمازیں ملا کر پڑھنے) کے راوی ابن عباس اور معاذ تک محدود نہیں ہیں۔ طبرانی عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ظہر اور عصر کو اور نماز مغرب وعشاء کو اس لیے اکٹھا کر دیا تا کہ آپ کی امت کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ (شرح موطا زرقانی صفحہ ۲۶۳)

اور بالکل یہی مطلب عبداللہ بن زبیر سے بھی نقل ہوا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس حالت میں جب آپ سفر میں نہ تھے دو نمازوں کو اکٹھا ادا کیا تا کہ آپ کی امت کو مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ (کنز العمال صفحہ ۲۴۲)

یہ ان احادیث میں سے چند ایک ہیں جنھیں اہل سنت کے محدثین نے اپنی حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا ہے اور اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ نمازوں کو الگ الگ پڑھنا مستحب ہے اور اگر ہم کسی وقت یہ محسوس کریں کہ اس مستحب کی رعایت کرنے سے خود فریضے کی ادائیگی پر زد پڑتی ہے تو خود رسول اکرمؐ کی ہدایات کے مطابق ہم اسے ترک کر سکتے ہیں یعنی دونوں نمازیں ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔

دور حاضر میں بہت سے خطوں میں طرز زندگی کچھ یوں ترتیب پا گئی ہے کہ اس امر مستحب کی رعایت کرنا تکلیف کا موجب بن گیا ہے اور اکثر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خود نماز کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ کی رہنمائی سے فیضان حاصل کرتے ہوئے زیادہ اہم امر کی بجا آوری کی خاطر تفریق (نمازیں الگ الگ پڑھنے) کے مسئلے کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ اہل سنت کے بہت سے فقہاء کا نظریہ اب بھی یہی ہے لیکن بعض امور کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اپنی رائے کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔

(رسالۃ الاسلام، سال ۷ شمارہ ۲ صفحہ ۱۵۶)

حمدرب الارباب

خطیب اعظم شمس العلماء مولانا سید سبط حسن نقوی فاطر جائسی طاب ثراہ

مصنوع زبان ہے خدا کی!
منزل در پیش ہے ثنا کی

کس طرح سے باب حمد کھولے حیران ہے چپ رہے کہ بولے
اک مضغۂ گوشت نطق ہمدم اللہ کی قدرت مجسم
تعبیر نمائے لفظ و معنا تصویر کش مراد زیبا
وہ فاتح باب قبلۂ دل وہ عقدہ کشائے عقد مشکل
خاموش ہے اس جگہ دہن میں گل ہوگئی بلبل اس چمن میں
کہتی ہے کہوں تو میرا کیا ہے جو کچھ ہے وہ سب دیا ہوا ہے

ناقص ہوں میں اور تو ہے کامل
عالم تری ذات، میں ہوں جاہل

خالق ہے تو اور میں ہوں مخلوق سابق ترا وصف اور میں مسبوق
ہوں شکل حباب اس جہاں میں بحرین عدم کے درمیاں میں
پہلے کو ہزاروں سال جھیلا تو ہی نے غریق کو ابھارا
تھا صورت موج بحر، مضطر لیتا رہا کروٹیں برابر
تحریک سے مضمحل رہا میں اصلاب میں منتقل رہا میں
کشتی تھی کوئی نہ بادباں تھا میں اور یہ بحر بیکراں تھا
مایوس کا آسرا تھا تو ہی معدوم کا ناخدا تھا تو ہی

جس وقت عیاں ہوا کنارا
اس کہنہ سرا میں لا اتارا

پیدا ہوئی شکل زندگانی مابین توان و ناتوانی!!
منزل ہوئی اس عدم کی آخر ساحل پہ گرا تھکا مسافر

صدیوں کا سفر یہ کم نہیں تھا		جب آنکھ کھلی تو دم نہیں تھا
فریاد کی دل شکن کہانی		لوگوں نے سنی مری زبانی

گذرا تھا جو یاد کررہا تھا
جینے کی خوشی میں مر رہا تھا

جنبش میں تھے دست و پا برابر		تھا پیش نظر وہ بحر اخضر
خشکی بھی تھی صورت تری میں		مشغول تھا میں شناوری میں
تڑپا کیا ہاتھ پاؤں مارے		اس حال میں رات دن گذارے
آخر کو ہٹے حجاب دہشت		کم ہونے لگی وہ پہلی وحشت
کانوں میں صدائیں آئیں پیہم		سمجھا کہ بسی ہے نسل آدمؑ
تھی بزم جہاں نشاط انگیز		ہر شے تھی برائے دل طرب خیز
سبزے سے زمیں کی سبزوردی		گردوں کی قبا تھی لاجوردی
پھولوں سے چمن مہک رہے تھے		تاروں سے فلک چمک رہے تھے
آرائش دہر تھی دل آویز		ہر جلوۂ ناز شوق انگیز
اک سمت نظر اٹھی جو اک بار		پھر دیکھا عدم کا بحر زخار
ہر اوج ہے اس کے آگے پستی		ہے لطمہ زن فضائے ہستی
پھیلا ہے حد نظر سے بڑھ کر		تاچاک قبائے صبح محشر
گردوں کی طرح محیط عالم		کم اس سے کہیں بسیط عالم
ہر موج عدوئے جسم و جاں ہے		ہر لہر پہ موج کا گماں ہے

اک جسم تو کیا جہان ڈوبے
چڑھ جائے تو آسمان ڈوبے

کوہ اس کے لیئے ہیں آبگینے		رخ کرتے نہیں ادھر سفینے
ہر نقش حیات دھو رہا ہے		دنیا کو وہی ڈبو رہا ہے
دکھلاتا ہے جب وہ چیرہ دستی		ہل جاتی ہے کل اساس ہستی
ہے اس میں جزیرۂ زمانہ		جس طرح کہ آسیا میں دانہ

نعت مرسل اعظمؐ

سنتا ہوں کہ اس کے زیر دامن
پنہاں ہوئے ہیں ہزاروں گلشن

ہر مزرعۂ دہر اس کا شاکی — طغیانیٔ بحر ہے بلا کی
قوموں کا ہوا نہ پار بیڑا — جو ڈوب گیا وہ پھر نہ ابھرا
حد ہے کہ گیا یہ بحر مواج — تا گو ہر شب چراغ معراج
وہ آیۂ رحمت الٰہی — وہ زینت تخت و تاج شاہی
وہ فاتحۂ کتاب تکویں — وہ خاتمۂ رسالت و دیں
مقصود کتاب پاک لولاک — رفعت دہ چرخ و نازش خاک
اول مخلوق کبریا کا — آخر مبعوث تھا خدا کا
قدموں سے لپٹ کے جس کی نعلین — دیکھ آئی مقام قاب قوسین
تھا جس کا وجود راز ہستی — ہر اک نفس اس کا ناز ہستی
انگشت نے جس کی شام اعجاز — دروازۂ ماہ کر دیا باز

محبوب بھی تھا حبیب تھا
ہے قول دنیٰ قریب بھی تھا

مناجات کے چند اشعار

''بین العدمین'' پابہ گل ہوں
کب حکم ہو، کب میں منتقل ہوں

نے میں ہوں نہ یہ سرائے فانی — چڑھتا ہوا آرہا ہے پانی
یہ تنگ زمانہ تنگ ہنگام — میں پا بہ رکاب وہ لب بام
تسبیح کروں تو وقت کم ہے — میں جس کو بھروں کہاں وہ دم ہے
یہ بحر فنا بھی کیا بلا ہے — دل جسم سے پہلے ڈوبتا ہے
مطلوب ثنائے تر زبانی — یہ آب کہاں جو ہو وہ پانی

ڈر نیش زن رجوع دل ہے
خم پیش خطر، رکوع دل ہے
اتنی بھی نہیں ہے دل میں قوت　　سمجھے جو اجل کو بے حقیقت
یہ دانۂ اشک جمع کر لے　　ہر تار نفس کی گود بھر لے
سبحہ ہو جو اس طرح کا تیار　　تسبیح کرے تری بہ تکرار
جب تار نفس اجل سے ٹوٹے　　سمجھے کہ اسیر ہوکے چھوٹے
اس وقت ہے لطف زندگانی
باقی پہ نثار ہو جو فانی

توبہ از عیوب بحضرت غفار

اے ساتر عیب معصیت کار
اے سامع نالۂ دل زار
اے مرہم زخم سرفروشاں　　اے اجر فزائے عیب پوشاں
بے برگ ہے نخل زندگانی　　اس خشک شجر کو دیدے پانی
معلوم ہیں ''کلک کن'' کی چالیں
گذری ہیں ہزارہا مثالیں
خود میں نے بھی قبل روح یابی　　دیکھا ہے یہ دور انقلابی
یہ حکم ترا ہوا تھا اک دن　　''نطفے'' سے لہو بنا تھا اک دن
پھر ''علقے'' کی شکل خوں ہوا تھا　　پھر مضغۂ گوشت خوں بنا تھا
اونچے کئے قصر جسم و جاں کے
دیدے کے ''ستون'' استخواں کے
انسان بنایا قصہ کوتاہ　　میں بول اٹھا تبارک اللہ
گو مبدء خلق تھی نجاست　　آخر میں تھا حلۂ طہارت
محراب میں ابروؤں کے پتلی　　دکھلانے لگی نشست لیلی
ہم سایوں میں اختلاف ڈالے　　چہرے تو سپید بال کالے
یہ پیکر خاک وضع عالی　　ہے آئینہ خانۂ جمالی

نعت سرورِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کہتا ہوں اس دلیل سے میں جانِ کائنات
ذاتِ نبیؐ ہے مرکزِ احسانِ کائنات

اچھا برا بھی سمجھو عزیزانِ کائنات
جو یہ سمجھ گیا وہ ہے انسانِ کائنات

پتھر نے پڑھ کے کلمۂ محبوبِ کبریا
بتلا دیا زمانے کو رجحانِ کائنات

جس کو نہیں ہے رحمتِ عالم کا اعتراف
کہنا بجا ہے ایسے کو نادانِ کائنات

دنیا ہے بے شعور تو سورج کی کیا خطا
اپنا نبیؐ ہے نیرِ تابانِ کائنات

سچ ہے کہ اس کو دولتِ کونین مل گئی
ہاتھ آیا جس کے دامنِ سلطانِ کائنات

امکان مصطفیؐ ہے پرے کائنات کے
اور کائنات تک ہی ہے امکانِ کائنات

خوشبو پسندِ خاطرِ اقدس ہے اس لیئے
لاکھوں ہیں اس زمیں پہ گلستانِ کائنات

قدموں پہ رکھ کے دولتِ دارینِ چشم و دل
ہاتھوں میں لے لو دامنِ سلطانِ کائنات

بولے ملک متاع تولا کو دیکھ کر
محشر میں خوب لائے ہو سامانِ کائنات

ہے کائنات بہرِ غلامانِ مصطفیؐ
بدبخت ہیں اسیفؔ غلامانِ کائنات

مشہدِ رضا علیہ السلام

شاعرِ اہلبیتؑ سید اشتیاق حسین رضوی ساحرؔ فیض آبادی (کراچی)

انقلابِ دہر کا انداز کیا انداز ہے
ہر زمانے کا نیا رخ ہے نیا انداز ہے

نائبِ مامون عباسی ہو اور حق کا ولی
اس ولی عہدی کا بھی سب سے جدا انداز ہے

اے امام موسیٰ کاظم کے چاند اے مہرِ دیں
جلوہ گسترِ مشہد دل پر ترا انداز ہے

اک نظر میں دیکھنے والے جسے پہچان لیں
مصحفِ ناطق کا وہ منہ بولتا انداز ہے

از محمدؐ مصطفیٰ تا قائمِ آلِ عباؑ
اول و آخر سبھی کا ایک سا انداز ہے

وہ علیؑ ابنِ محمدؑ ابنِ جعفرؑ آگیا
زندگی کا جس کی تسلیم و رضا انداز ہے

آٹھواں رخ ہے رسول اللہ کی تصویر کا
ہیں وہی تیور وہی نام خدا انداز ہے

جب دیا سائل کو منہ مانگا دیا چھپ کر دیا
ہاشمی غیرت کا جیتا جاگتا انداز ہے

اللہ اللہ رفعتِ شانِ امامِ انس و جاں
عرش کہتے ہیں جسے وہ فرش پا انداز ہے

ہم ہیں ساحرؔ اپنے آقا کے غلاموں کے غلام
ناز کے قابل ہمارے ناز کا انداز ہے

قصیدہ درمدح امام رضا علیہ السلام

مولانا محمد عباس رضوی صاحب قبلہ طاب ثراہ آل باقر العلومؒ

ہری بھری ہیں ڈالیاں گلوں پہ کیا نکھار ہے
ہے اعتدال پر ہوا شباب پر بہار ہے

جنوں کی حد یہ ہوگی گربیاں تار تار ہے
تماشہ بیں ہیں ہر طرف لگی ہوئی قطار ہے

چہک رہیں ہیں بلبلیں چمن بنا ہے لالہ زار
نمود صبح ہے عجب نسیم خوشگوار ہے

چمن چمن میں دھوم ہے ہجوم ہی ہجوم ہے
نشاط آج عام ہے قدم قدم بہار ہے

اذیتیں ہیں جانفزا تو غم بھی خوشگوار ہے
میں کشتۂ خزاں سہی خزاں سے مجھ کو پیار ہے

جھلک ہمارے خون کی نمایاں پھول پھول سے
ہیں مالک بہار ہم چمن پہ اختیار ہے

تسلی دے رہا ہوں میں تڑپتے دل کو بار بار
نہ دل پہ اختیار ہے نہ تم پہ اعتبار ہے

ہے مضطرب یہ دل مرا وفا کریں گے کب تلک
تڑپ رہا ہوں میں بہت تمہارا انتظار ہے

اے اخترؔ اب سنا تو دو سبھوں کو مطلع جلی
یہ رند پاکباز ہیں جنھیں نہیں خمار ہے

ڈھکی نہیں چھپی نہیں یہ بات آشکار ہے
ثنائے حضرت رضاؑ رضائے کردگار ہے

ولا ہے ہر امام کی وسیلۂ نجات خلق
حقیقتاً اسی پہ بس ثواب کا مدار ہے

ہوئی ولادت رضاؑ چمک اٹھی فضائے دہر
یہ بزم مختصر یہاں اسی کی یادگار ہے

جناب نجمہ خوش ہیں اب چمک رہا ہے نور حق
رضاؑ کمال حسن میں مثال کردگار ہے

گئے ہیں جس گھڑی رضاؑ عدو کی بارگاہ میں
اٹھایا پردہ دوش پر ہوا نے بار بار ہے

جو شیر کی مثال تھی اسی میں روح پھونک دی
یہ معجزہ بھی آپ کا جہاں میں آشکار ہے

ہزار اہتمام ہے کہ آمد امام ہے
سلام بار بار ہے درود بے شمار ہے

التماس دعائے صحت برائے ادیب العصر جناب سبط محمد نقوی صاحب

زیر نظر شمارہ قریب تکمیل تھا کہ اچانک یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ادیب العصر فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی صاحب ایک سڑک حادثہ میں زخمی ہوگئے ہیں۔ اراکین نور ہدایت فاؤنڈیشن جناب عالی کی صحت کے لئے دعا گو ہیں اور تمام مومنین سے بھی گذارش ہے کہ جناب عالی کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

خبرنامہ

(ادارہ)

مجالس بیادگار سید العلماءؒ

عالم اسلام کے جید و متبحر عالم نیز سیکڑوں کتب کے مصنف اور مفسر قرآن آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا **سید علی نقی النقوی** طاب ثراہ کی سولہویں برسی کے موقع پر سالانہ مجالس بتاریخ ۴، ۵ دسمبر کو حسینیۂ جنت مآبؒ عبدالعزیز روڈ میں مولانا کے خلف الرشید مفکر ملت عماد العلماء مولانا **سید علی محمد نقوی** صاحب کی زیر سرپرستی منعقد ہوئیں۔ جس کو ہندوستان کے مشہور خطباء و ذاکرین (مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب قبلہ (امام جمعہ لکھنؤ) مولانا اطہر عباس صاحب قبلہ (کلکتہ) مولانا ڈاکٹر رضوان حیدر صاحب (الٰہ آباد) اور مولانا رضا عباس صاحب (علی گڈھ)) نے خطاب کیا۔

عظیم مجالس

نقیب اتحاد صفوۃ العلماء کی اٹھارہویں برسی

رہبر ملت، قائد مسلمین ہند، آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد رحمت مآبؒ طاب ثراہ کی یاد میں حسینیۂ غفرانمآبؒ میں ۱۱ر ۱۲ر ۱۳ر دسمبر کو معین الشریعہ مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب کی زیر سرپرستی مجالس ایصال ثواب منعقد ہوئیں۔ جن کو ملک کے مشہور و معروف علماء کرام اور خطباء و ذاکرین عظام نے خطاب کیا۔

مجالس کا آغاز ۱۱ر دسمبر کو تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مفکر و دانشور مولانا سید سمیع الحسن وسیم جائسی صاحب نے پہلی مجلس کو خطاب کرتے ہوئے سیرت اہلبیتؑ پر روشنی ڈالی اور مومنین کو ان کی سیرت پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی۔ اس کے بعد مدرس وثیقہ عربی کالج فیض آباد مولانا وصی حسن خاں صاحب قبلہ، جونپور سے تشریف لائے مولانا سید کاظم مہدی عروج صاحب اور مولانا صفدر حسین صاحب، بارہ بنکی سے آئے ہوئے مولانا قائم مہدی صاحب اور تنظیم المکاتب کے سکریٹری مولانا سید صفی حیدر صاحب قبلہ نے اپنے اپنے خطابات سے مومنین کو مستفیض کیا۔

اور دوسرے دن (۱۲ر دسمبر کو) کی مجالس کا آغاز پروفیسر مولانا سید کمال الدین اکبر صاحب کے بیان سے ہوا۔ اس کے بعد دوسری مجلس کو مولانا شمشاد احمد صاحب قبلہ (چھولس) تیسری مجلس کو مولانا ڈاکٹر رضوان حیدر صاحب (الٰہ آباد) چوتھی مجلس مولانا سید امام حیدر زیدی صاحب، پانچویں مجلس مولانا مرتضیٰ جعفری صاحب قبلہ (بہار) چھٹی مجلس کو مولانا حسن الحسن نیرؔ صاحب قبلہ (الٰہ آباد) ساتویں مجلس کو مولانا نعیم عباس صاحب قبلہ پرنسپل جامعۃ المنتظر نوگانواں سادات اور آخری مجلس کو مولانا مظاہر علی صاحب قبلہ (سیتھل) نے خطاب کیا۔

تیسرے دن (۱۳ر دسمبر) کی مجالس کا آغاز مدیر اصلاح مولانا سید محمد جابر جوراسی صاحب قبلہ کے بیان سے ہوا۔ دوسری مجلس کو مولانا رئیس احمد صاحب، تیسری مجلس کو بنارس کے بزرگ عالم دین مولانا احمد حسن صاحب قبلہ، چوتھی مجلس کو مولانا مظفر حسین قاسمی صاحب قبلہ، پانچویں مجلس کو مولانا کلب رشید صاحب نے خطاب کیا۔

شام کی نشست میں جلالپور کے مولانا ڈاکٹر عباس رضا نیرؔ صاحب اور مولانا عروج الحسن میثم صاحب نے فضائل و مصائب اہلبیتؑ بیان کیے۔ اور اس سہ روزہ عظیم مجالس کی آخری مجلس میں مفکر اسلام علامہ عقیل الغروی صاحب قبلہ (دہلی) نے جبر و اختیار جیسے اچھوتے موضوع کو اپنا عنوان بیان قرار دیتے ہوئے جبر واختیار کی فلسفیانہ تعبیروں کو بآسانی مومنین کے اذہان عالیہ تک منتقل کیا۔

آپ نے عشق خدا، عشق رسولؐ اور عشق اہلبیتؑ کے حقیقی مظاہر بیان کرتے ہوئے رائج الوقت اوہام وخرافات سے دور رہنے کی تلقین فرمائی۔

سید سبط رضی صاحب جھارکھنڈ کے گورنر مقرر

شہرۂ آفاق و مردم خیز دار العلوم جائس کے ہونہار فرزند سید سبط رضی نقوی تاریخی اعتبار سے تیسرے نقوی خاندان سے متعلق ایسے جائسی ہیں جنھیں عہدۂ صدارت ریاست سے نوازا گیا۔ یعنی پہلی ذات فقیہ العصر علامہ نواب نجم الملک سید نجم الدین سبزواری کی ہے جو ایران میں صوبیدار تھے۔ دوسری ذات ملا سید پیارہ حسینی کی ہے جو عہد اکبری میں علاقۂ الٰہ آباد کے صوبیدار تھے اور تیسرے علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ جناب سبط رضی صاحب ہیں۔ اراکین مؤسسۂ نور ہدایت موصوف کو اس منصب جلیل کے ملنے پر تہنیت پیش کرتے ہیں اور درازی عمر و اقبال کے لئے دعا گو ہیں۔

جہنم اور دنیا کے لالچ میں کوئی فرق نہیں

مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۳؍دسمبر: دنیا کی محبت کے ہوتے ہوئے انسان کی زندگی میں ہوس کبھی کم نہیں ہوتی اور ہوس ہی دنیا میں پھیلی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جہنم بنانے سے بچے کیونکہ جہنم اور دنیا کی لالچ میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ وہاں جہنم ہل من مزید کی صدا دے گی اور یہاں انسان کی ہوس ہل من مزید کی صدا دیتی ہے اور اسی صدا کے چلتے انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے برے اور غلط طریقہ سے دولت کمانے میں مصروف ہے جو غلط ہے اور جس سے ہمیں ہر حال میں بچنا ہوگا۔

یہ باتیں جمعہ کے موقع پر آصفی مسجد میں موجود ہزاروں نمازگزاروں کو خطاب کرتے ہوئے شیعہ قائد مولانا کلب جواد صاحب نے کہیں۔

مولانا موصوف نے کہا کہ دنیا کی ہوس کبھی کم نہیں ہوتی لیکن یہ سمجھ لیں کہ دنیا کے پیچھے بھاگنے والا زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا میں غلط طریقے سے کمائی گئی دولت کو نہ اکٹھا کرے بلکہ غریبوں، مظلوموں اور بیواؤں کی مدد اور دوسرے نیک اعمال کے ذریعے آخرت کے لیے دولت اکٹھا کرے تبھی اسے دنیاوی و دینی سکون اور جنت حاصل ہوگی۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم گناہوں سے بچیں اور نیک کام کریں تاکہ ہماری آخرت بہتر ہوسکے۔

مولانا موصوف نے کانگریس کی مرکزی حکومت کی جانب سے سید سبط رضی جائسی صاحب کو گورنر بنائے جانے پر اظہار مسرت کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ جلد ہی اور شیعہ لیڈروں کو بھی اہم عہدوں سے نوازا جائے گا۔

مولانا کلب جواد صاحب نے چاند کے مسئلے کے سلسلے میں کہا کہ یہ اہم مسئلہ دو ایک لوگوں سے حل ہونے والا نہیں ہے لہٰذا واقعی ایک مرکزی چاند کمیٹی کی سخت ضرورت ہے جسے عمل میں لایا جائے اور جو اتفاق رائے سے اس مسئلے کو حل کیا کرے ورنہ ہمیشہ یہ مسئلہ اٹھتا رہے گا جو ٹھیک نہیں ہے۔

نوتشکیل شیعہ وقف بورڈ کو ابھی ہماری حمایت حاصل نہیں: مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۱۷؍دسمبر: نماز جمعہ کے موقع پر آصفی مسجد میں نمازیوں کے درمیان امام جمعہ مولانا سید کلب جواد نے کہا کہ ملائکہ انسان اور حیوان میں حضرت علیؑ نے فرق بتایا ہے۔ ان کا قول کا ہے کہ حیوان میں صرف اور صرف جذبات اور خواہشات ہوتی ہیں مگر عقل نہیں ہوتی ملائکہ میں خواہشات نہیں ہوتیں صرف عقل ہوتی ہے مگر انسان میں خواہشات و جذبات کے ساتھ ساتھ عقل بھی ہوتی ہے۔ جس کی عقل اس کے جذبات پر غالب آجاتی ہے ایسا انسان ملائکہ سے بھی افضل ہوجاتا ہے اور اگر اس کے جذبات وخواہشات اس کی عقل پر غالب آجائیں تو وہ جانوروں سے بھی پست ہوجاتا ہے۔ انسان کو اپنی خواہشوں کا غلام نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی خواہشات کو اپنی عقل کے اختیار میں رکھنا چاہیے تبھی وہ ملائکہ سے افضل ہوسکتا ہے۔ آج انسان اپنی خواہشوں کا غلام ہوگیا ہے اس کی خواہشات لامحدود ہیں جس کی وجہ سے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوگیا ہے۔ انسان کا کردار اس کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اللہ نے انسان کو ایک سادہ کاغذ کی طرح پیدا کردیا اور برش اس کے ہاتھ میں دیدیا ہے، اب ہمیں اپنی تصویر زندگی خود بنانا اور سنوارنا ہے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ دو کمزوریاں انسان کی قاتل ہیں: ایک دنیا کی ہوس دوسرے اس کی لامحدود خواہشات۔ انھیں لامحدود خواہشات کی بنا پر لوگ اوقاف کی جائدادوں پر ناجائز قبضے کرکے کروڑوں روپئے کا مال ہضم کرنے کے بعد بھی ڈکار نہیں لیتے۔

انہوں نے کہا ایک تحریک چلی تھی اوقاف کی حفاظت کی خاطر اب نیا بورڈ آیا ہے ہماری کسی سے رشتہ داری نہیں ہے۔ ہاں ہماری رشتہ داری صرف اس سے ہے جو ایمانداری سے کام کرے اور تعلقات صرف اس سے ہیں جو صحیح کام کرے۔ ابھی نئے وقف بورڈ نے اپنا کام شروع نہیں کیا ہے۔ ابھی یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کو ہماری مکمل حمایت حاصل ہے۔ ہم کسی کی آنکھ بند کرکے حمایت نہیں کرتے حمایت تب ملے گی جب وہ صحیح طرح کام کریں اور اگر صحیح کام نہیں کیا جو جس طرح ہم پہلے مخالفت کرتے تھے اب بھی کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وقف بورڈ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے صرف سرکاری حیثیت ہے کیوں کہ سرکار نے بنایا ہے لہٰذا مجبوراً ہم کو قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ سرکار نے قانون بنا دیا ہے لہٰذا جب تک سرکار یہ قانون ختم نہ کردے تب تک وقف بورڈ کی ذمہ داری صرف علماء پر ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں آج صرف دوہرا رہا ہوں کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ہمارا نظریہ بدل گیا ہے لہٰذا اگر نئے بورڈ نے صحیح کام کیا تو قابل قبول ہے ورنہ کسی قیمت پر قابل قبول نہیں۔

دسمبر ۲۰۰۴ء / ذی القعدہ ۱۴۲۵ھ

ماہنامہ

شعاع عمل

لکھنؤ

موسسۂ نور ہدایت حسینیۂ غفران مآبؒ لکھنؤ-۳

Monthly

R.N.I.No. UPBIL/2004/13526 - December-2004

SHUA-E-AMAL

Lucknow

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab, Chowk
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230

فہرست مضامین

دسمبر ۲۰۰۴ء

سخنان

ماہنامہ ''شعاع عمل'' کا شمارہ ہشتم جن معصوموں کی تاریخہائے ولادت وشہادت سے متعلق ہے وہ ہمارے آٹھویں اور نویں امام یعنی امام ضامن حضرت علی رضا علیہ السلام اور حضرت محمد تقی علیہ السلام ہیں۔

سید العلماءؒ فرماتے ہیں ''......حضرت امام رضاؑ کو جنھیں سلطنت بنی عباس کے ولی عہد بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا، یہ مثال پیش کرنے کا موقع ملا کہ ابنائے دنیا کے اندر رہتے ہوئے اور دنیاوی سلطنت کے ماحول اور دنیاوی سیاست کے اندر قدم رکھتے ہوئے، پھر کس طرح ہر ہر قدم پر اپنے خدا کی مرضی کو پیش نظر رکھا جاتا اور اپنے دامن پر کسی قسم کی کوتاہی کا دھبا نہیں آنے دیا جاتا اور ہر حال میں اپنے اس بلند فریضہ کو پورا کیا جاتا ہے جس کے لیئے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

حضرت امام محمد تقیؑ کی عمر معصومینؑ میں سب سے مختصر ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ کوئی زندگی اگر نوع انسانی کے لیئے صحیح نمونہ بن کر سامنے آئی ہوتو چاہے وہ بہت کم وقت میں ختم ہوجائے مگر اس کے پائدار نقش جو انسانی دماغوں پر قائم ہوگئے ہیں کبھی نہیں مٹتے اور باوجود اپنے مختصر ہونے کے نتیجہ کے لحاظ سے اور افادیت پر نظر کرتے ہوئے تاریخ انسانی کا وہ اتنا ہی اہم باب قرار پاتی ہے جتنا زیادہ عمر کو حاصل کر کے کسی انسان کی زندگی ہوسکتی ہے۔''

کاش ہم ان ذوات مقدسہ کے کردار وعمل سے استفاضہ کر کے اللہ تعالیٰ اور صاحبان عصمت کی خوشنودی حاصل کرتے۔

آقائے قوم قدوۃ العلماءؒ کی تحریک دینداری و بیداری

آقائے قوم نے ملت کے علمی وعملی معیار کو بلند کرنے کے لیئے اور قوم کی پستی و بلندی کے اتفاقات وحادثات وواقعات کو تحریری صورت میں ہر ایک تک پہونچانے کے لیئے لکھنؤ کی شیعی دنیا کا پہلا رسالہ ماہنامہ ''معالم'' یکم محرم الحرام ۱۳۱۸ھ میں جاری فرمایا جس کے قدوۃ العلماء مولف و مدیر تھے اور ساتھ ہی اخبار ''الناطق'' جاری فرمایا۔ یہ بھی اولیت و دیگر خصوصیات کے اعتبار سے 'معالم' ہی کا ہم پلہ تھا۔ یہ رسالہ اور اخبار پہلے تصویر عالم پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر دفتر عماد الاسلام جوہری محلہ سے شائع ہوتے تھے جو بعد قیام مطبع عماد الاسلام اپنے ہی پریس میں طبع ہونے لگے۔ دفتر اور مطبع دونوں کے مالک ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین نقوی تھے۔ اخبار و ماہنامہ دونوں نے برسوں بلکہ انجمن صدر الصدور کے شیعہ کانفرنس بننے تک

قرآن مجید

کاملیت وہمہ گیری ــــ تکمیل انسانیت واخلاق اورقرآن

محقق کبیر علامہ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری طاب ثراہ

قرآن مجید کا دعویٰ ہے (ہم نے کتاب میں کوئی شئے بغیر بیان کے نہیں چھوڑی ہے) ــــ قرآن مجید نے زندگی کے کل بنیادی اصول بیان کردیئے ہیں انھیں تفصیل و شرح واستنباط کی روشنی میں ہر آنے والا دور اپنے نئے نئے مسائل کا اخذ کرے گا اور کرتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو سال میں قرآن مجید کے اس دعویٰ کی تصدیق ہوگئی۔ اور کروروں انسانوں نے اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال کر اس کا عملی ثبوت دیا کہ یہ ایک مکمل دستور زندگی ہے اور زندگی کے کل شعبوں پر محیط ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہر فضا و ماحول میں قرآن مجید نے پوری پوری رہنمائی کی۔ علوم و فنون کے سیلاب نے جبکہ سیکڑوں اوہام وخرافات کو خس و خاشاک کی طرح فنا کردیا اور ہزاروں مذاہب وملل اور فلسفے نیست ونابود ہوگئے۔ قرآن اور اس کا نظام زندگی اسی طرح انتہائی توانائی سے قائم ہے، اسکے اسرار ورموز وحکم ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔ ذہین انسان اس کے اصول وحکم کے پیچھے دوڑ رہا ہے مگر اس ذخار سمندر کا کنارہ انسان کو ابھی تک نہیں ملا۔ اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ کبھی اس کا کنارہ نہ ملے گا۔

قل لو کان البحر.............کلمات ربی

(ترجمہ) اے پیغمبر آپ یہ پیام سنا دیں کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں جب بھی اسرار کلمات الٰہی کا احاطہ ناممکن ہے۔ سمندر کا پانی ختم ہوجائے گا لیکن کلمات الٰہی اور اس کے اسرار کا احاطہ نہ ہوسکے گا۔

قرآن مجید نے ایک عجیب وغریب دلکش انداز ہدایت پیش کیا۔ معرفت الٰہی جسے صرف وجدانی وذوقی چیز سمجھا جاتا تھا اسے علم وحکمت ومطالعہ نشر وآفاق پر مبنی قرار دیا گیا۔ قرآن مجید کی قوت قیادت حیرت انگیز ہے دلائل کا استحکام اس سے مخصوص ہے۔ ماضی وحال و مستقبل کے نامعلوم واقعات اس میں اس طرح موجود ہیں کہ نئے نئے انکشافات روز اس کی تفسیر وشرح پیش کررہے ہیں۔ اس سچائی کو دلنشین کرنے کا نیا قدرتی اسلوب اختیار کیا گیا۔ اس میں بہتر سے بہتر مذہب اور اونچے سے اونچے قوانین موجود ہیں۔ اس میں روحانیت کے اعلیٰ اصول ہیں۔ صحت ونمو جسمانی تنومندی کے بہترین آئین موجود ہیں۔ فرد کے تقاضے اس میں ہیں، جماعت کے مطالبے اس میں ہیں۔

نوع انسانی کو عقل ودماغی تکمیل وترقی کے لیے جن ضابطوں کی ضرورت ہے وہ اس میں پائے جاتے ہیں۔

اس کے احکام کی بنیاد قوانین فطرت پر قائم ہے۔ اس لیے یہ ہر زمانے کے جائز وضروری تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہے۔ اختلاف و تضاد و نقص و تعصب و تنگ نظری سے پاک ہے۔ اس کے الفاظ و معانی میں اسقدر زندگی ہے کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد دل سیر نہیں ہوتا اور نہ اس کے مضامین کی شگفتگی میں کمی آتی ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کے سامنے اس عجیب ثقافتی معجزے کی جب توجیہ پوچھی گئی تو حضرت نے فرمایا:

سوال ہوا کہ:۔ کیا وجہ ہے کہ قرآن میں تعلیم و اشاعت سے اور شگفتگی آتی ہے۔ امامؑ نے فرمایا: ـــــ اس لیے کہ خدا نے اسے کسی خاص زمانے کے مسائل سے مخصوص نہیں فرمایا ہے نہ کسی خاص قوم و جماعت سے مخصوص قرار دیا ہے۔ وہ ہر زمانے میں نیا ہے اور ہر قوم کے لیے ناز ہے اور قیامت تک اس کی تازگی میں یوں ہی اضافہ ہوتا رہے گا۔

(امالی بن شیخ محمد بن طوسی مطبوعہ ۱۳۱۳ھ)

کوئی تاریخی زمانہ اور کوئی انسانی جماعت اس کے اثرات تعلیم کی ہمہ گیری سے مستثنیٰ نہیں۔ کئی عظیم جنگیں سائنس کے غلط استعمال سے اپنی ہولنا کی کا منظر پیش کر چکی ہیں۔ ان کو قرآن کی ان آیات کی روشنی میں پڑھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ آیتیں آج ہی نازل ہوئی ہیں:

(ترجمہ) خدا اس بات پر قادر ہے کہ فضا سے اور زمین کے اندر سے تمھیں عذاب میں مبتلا کرے اور تمھیں پراگندہ کر دے اور ایک کو دوسرے کے خوف و دہشت کا مزہ چکھائے۔

(ترجمہ) انتظار کرو جبکہ فضا سے دھواں اٹھے گا اور لوگ تکلیف و عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ذیل کی آیات میں ہولناک جنگوں کے اسباب بھی مذکور ہیں۔

(ترجمہ) خدا نے ایک گاؤں کی مثال سے یہ سمجھانا چاہا ہے کہ قومیں کس طرح اپنی سرکشی و کفران نعمت سے برباد ہوتی ہیں ـــــ ''ایک گاؤں تھا جس میں لوگ خوشحال و مطمئن و فارغ البال رہتے تھے۔ اسباب معیشت نہایت آسانی سے مہیا ہو جاتے تھے ان لوگوں نے کفران نعمت کیا اور اس کے نتیجہ میں خدا نے ان کو بھوک اور خوف کا مزا چکھایا۔

قرآن مجید کی ہمہ گیری و کاملیت و جامعیت کا یہ حال ہے کہ اس سے طب و صحت و تاریخ طبعی علم الحیوان و کیمیا و طبقات الارض و بیالوجی و طبیعیات (ہوا، پانی، آگ، گرمی، آواز، روشنی، کہرا، مقناطیسیت، ، فلکیات، جغرافیہ، تقویم بلدانی، بحری سفر، تیراکی، سیاحت، تاریخ اثری، تاریخ عام، فنون جنگ، صنعت و حرفت، تجارت، حساب و ہندسہ و تعمیرات و انشاء وغیرہ) کے لیے علماء نے ہدایتیں پائیں اور متعدد کتابیں علوم قرآن پر عالم وجود میں آئیں۔ قرآن مجید کے چند مسائل پر اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ تخلیق و ایجاد ـــــ ان اللہ خالق کل شئی (خدا ہر چیز کا خالق ہے)

۲۔ علم و قدرت ـــــ (تمہارا پروردگار خالق و عظیم ہے حاضر و غائب سب سے واقف ہے) (جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ عالم و قادر ہے۔)

۳۔ ربوبیت ــــ (ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے بقدر ضرورت اسے ہم نازل کرتے ہیں۔ ہر شئے اس کے پاس ایک خاص مقدار میں موجود ہے) (لوگو نعمت الٰہی کو یاد کرو کیا خدائے واحد کے علاوہ کوئی اور خدا ہے) وہ تم کو فضا اور زمین سے رزق دیتا ہے وہی روزی رساں اور صاحب قوت ہے۔

۴۔ توحید ــــ (وہی آسمان پر خدا ہے اور وہی زمین پر خدا ہے)

۵۔ خدا کے سفیر ــــ لقدر ارسلنا رسلنا بالبینات (ہم نے اپنے رسول دلائل کے ساتھ بھیجے) (خدا بہتر جانتا ہے کہ اسے کسے نبی بنانا چاہیے)

(ہم کسی قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتے جب تک رسول بھیج کر اتمام حجت نہیں کرتے۔)

(ہر امت میں خدا کی طرف سے عذاب الٰہی سے ڈرانے والے نبی آتے رہے ہیں)

(گذشتہ اقوام میں بہت سے نبی آتے رہے ہیں)

(ہر امت میں ہم نے پیغمبر بھیجے)

۶۔ رسالت محمدیہؐ ــــ (ہم نے تم کو کل انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے)

۷۔ جنت و دوزخ ــــ (جنت آسمان و زمین کی عرض کی طرح ہے)

۸۔ فرشتے ــــ (خدا کی فوج کا علم اسی کو ہے)

(حاملان عرش تسبیح الٰہی کرتے ہیں)

۹۔ جبرئیل ــــ (کہیے کہ اسے روح القدس خدا کی جانب سے لائے ہیں)

۱۰۔ جن ــــ (جن و انس کی خلقت عبادت کے لیے ہے)

۱۱۔ حضرت آدم علیہ السلام ــــ (خدا نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بناؤں گا جب وہ بن جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے تو تم سب اس کی تعظیم کرنا)

۱۲۔ شرف انسانی ــــ (ہم نے بنی آدم کو پیدا کیا اور ان کے لیے خشکی و دریا میں چلنے کے اسباب مہیا کیے اور حلال روزی اور بہت سی مخلوق پر انھیں فضیلت دی)

۱۳۔ شریعت الٰہی ــــ (جو احکام خدا نے بھیجے ہیں ان پر عمل کرو)

۱۴۔ نیکی و بدی کی تمیز کے مواقع ــــ (ہم نے تمہاری رہنمائی کر دی ہے خواہ تم شکر گزار بنو یا کافر نعمت)

۱۵۔ انسانی اختیار ــــ (اچھے اور برے کام جو کرو گے اس کی ذمہ داری تمھیں پر ہے۔ اچھا کام کرو گے اس سے تمھیں فائدہ ہوگا۔ برا کام کرو گے اس سے نقصان اٹھاؤ گے)

۱۶۔ عدالت الٰہی ــــ (اے رسولؐ کہہ دو کہ عالم اور جاہل کیا دونوں مرتبہ میں برابر ہوسکتے ہیں؟ (ہرگز نہیں) اہل عقل اس فرق کو سمجھتے ہیں) (۲۳ــــ۱۴) (کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم انھیں اہل ایمان اور صالحین کے برابر کر دیں گے جو زمین پر فساد برپا کرتے اور فاجروں کو پرہیزگاروں کے برابر کر دیں گے) (ہرگز نہیں)

۱۷۔ اصلاح نفس ــــ (کامیاب وہ ہے جس نے اصلاح نفس کی اور ناکام وہ ہے جس نے نفس کو گندہ کیا) (جسے خوف الٰہی ہوگا اور جو نفس کو اپنے برے اقدامات سے روکے گا جنت اس کی فرودگاہ ہوگی)

۱۸۔اصول تبلیغ ــــ (خدا کی طرف حکمت و موعظہ حسنہ سے دعوت دو اور بہترین طریقہ سے بحث کرو)

۱۹۔فرقہ بندی ــــ (آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے) (ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو فرقہ بندی میں مبتلا ہو گئے اور روشن دلیل آنے کے بعد بھی اختلاف میں پڑ گئے) ــــ (پس پراگندہ نہ ہو، دین الٰہی کے رشتے کو مضبوطی سے پکڑو)

۲۰۔موت وحیات ــــ (تم مردہ تھے (مٹی) تمھیں خدا نے زندہ کیا پھر تم پر موت طاری کرے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا۔)

۲۱۔برزخ ــــ (تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)

۲۲۔روز جزاء ــــ (کیا انسان نے یہ سمجھا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا) یعنی کوئی مقصد اس کی زندگی کا نہیں اور نہ کوئی محاسبہ ہوگا۔

(کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس پلٹ کر نہ آؤ گے)

۲۳۔قیامت ــــ (قیامت کا دن وہ ہوگا کہ زمین و آسمان سب بدل جائیں گے)

(اور سب انسان خدائے واحد وقہار کے سامنے حاضر ہوں گے)

۲۴۔فیصلہ ــــ (اس دن کچھ لوگ جنت میں جائیں گے اور کچھ لوگ جہنم میں)

۲۵و۲۶۔علم وحکمت ــــ (خدا جسے چاہتا ہے علم وحکمت سے نوازتا ہے جسے علم وحکمت کا فیض ملا اسے سب کچھ ملا)

۲۷۔جہالت ــــ (اگر تم میں سے سو آدمی ہوں مگر ہزار کافروں پر غالب ہوں گے کیونکہ کافر بے علم ہیں)

۲۸۔تواضع ــــ (اپنے بازو مومنین کے لیے جھکاؤ) (۱۴-۶)

۲۹۔کبر ــــ (جن لوگوں نے نفرت کی اور غرور وتکبر سے کام لیا وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے) (۱۶-۶)

۳۰۔دشمنی ــــ (اہل ایمان میں دوستی سے کام لو شیطان کی پیروی نہ کرو (دشمنی سے کام نہ لو) شیطان تمہارا (کھلا) دشمن ہے۔

۳۱۔سخاوت ــــ (جو لوگ خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے اپنا مال صرف کرتے ہیں۔ ان کی مثال اس دانے کی ہے جسمیں سات بالیاں ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ جسے چاہتا ہے دگنا کرتا ہے۔)

۳۲۔بخل واسراف ــــ (نہ بخل کرو اور نہ اسراف)

۳۳۔صلۂ رحم ــــ (معبود برحق سے ڈرو جس کا تم واسطہ دیتے ہو اور رشتہ دار کے معاملہ میں خدا سے ڈرو (بدسلوکی نہ کرو) (۳)

۳۴۔والدین ــــ (ماں باپ سے دنیا میں نیکی سے پیش آؤ اور ان سے جھک کے ملو اور خدا سے ان کے لیے یوں دعا کرو معبود جس طرح انھوں نے میرے بچپنے میں میرے ساتھ کریمانہ برتاؤ کیا تو بھی ان پر رحم کر)

۳۵۔غیبت ــــ (ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو نہ اس کی ٹوہ لیا کرو۔)

۳۶۔اصلاح ــــ (اپنے بھائیوں کے جھگڑوں کی اصلاح کرو۔)

۳۷۔بغاوت ــــ (خدا فحش اور بری باتوں سے منع کرتا ہے اور بغاوت سے روکتا ہے۔)

۳۸-وعدہ ــــ(اچھے لوگ اپنی نذر (وعدہ) کو پورا کرتے ہیں اور روز قیامت سے ڈرتے ہیں۔)

۳۹-انصاف ــــ(عدل سے کام لو یہ پرہیزگاری سے بہت قریب ہے)

قرآن مجید میں اخلاقیات پر بہت توجہ کی گئی ہے اگر ان آیات کو نقل کیا جائے تو قرآن کے بڑے حصہ کو نقل کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔

۴۰-اسلامی سیاست ــــ اسلام فرد و جماعت دونوں کی تکمیل کی ذمہ داری لیتا ہے اس نے اگر تہذیب نفس و تدبیر منزل کے مسائل بتائے تو تمدنی مسائل و اجتماعی قوانین کو بھی بڑی شدومد سے بیان کیا۔

۴۱-اجتماعی عدالت ــــ انصاف و عدالت میں کسی قوم کا پاس نہیں کیا بلکہ قرآن میں اعلان کیا ''جب تم انسان کے مسائل کا فیصلہ کرنے پر مامور ہو تو عدل سے کام لو۔(۵-۵)

۴۲-خود اعتمادی و تنظیم عسکری ــــ(مخالفین کے تحفظ کے لیے پوری کوشش سے منظم ہو جاؤ۔ قوت اور سواری کا انتظام رکھو جس سے خدا کے اور اپنے دشمن کو مرعوب کر سکتے ہو۔)

۴۳-ادائے امانت ــــ بھی ایک اسلامی اخلاق ہے اور مومن و کافر سب کے لیئے عام ہے۔ ''خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ جن کی امانتیں تمہارے پاس ہیں ان کو واپس کر دو'' (۵-۵)

۴۴-فساد کی مذمت ــــ ''ملک میں اصلاح کے بعد فتنہ انگیزی کرتے نہ پھرو۔'' (۸)

۴۵-تعزیرات و حدود ــــ(زنا کار عورت و مرد کو سو سو کوڑے مارو۔)(چور مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹو یہ ان کے کرتوت کی سزا ہے۔)(کسی کو بے وجہ قتل نہ کرو۔)

(جو کسی مومن کو ارادۃً قتل کرے وہ ہمیشہ جہنم میں جلے گا اس کے لیے خدا نے سخت عذاب مقرر کر رکھا ہے۔)

(مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مومن کو قتل کرے۔ اگر غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کے عزیزوں کو دیت دیدو اور ایک مومن غلام آزاد کرو یا غلام کے عوض میں مسلسل دو مہینے روزے رکھو۔)

(اے اہل ایمان تمھیں مقتول کے عوض اجازت دی گئی ہے، آزاد کے بدلے آزاد کو قتل کرو، غلام کے بدلے میں غلام کو، عورت کے بدلے میں عورت کو، اور اگر کوئی بھائی معاف کر دے تو یہ اس کا اچھا فعل ہے۔)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆ اِذَا اَحَبَّ اَحَدُکُمْ اَنْ یُحَدِّثَ رَبَّہٗ فَلْیَقْرَأِ الْقُرْاٰنَ

''جب بھی تمہارا خدا سے گفتگو کو دل چاہے تو قرآن مجید کی تلاوت کر لیا کرو۔'' (کنزالعمال: حدیث ۲۲۵۷)

☆ فَضْلُ الْقُرْاٰنِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِہٖ

''قرآن کو دوسرے تمام کلام پر ویسی ہی فضیلت اور برتری ہے جیسی خدا کو اپنی مخلوقات پر۔'' (بحارالانوار جلد ۹۲ ص ۱۹)

امام علی رضا علیہ السلام اور سیاسی جدوجہد

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

ترجمہ: مولانا سید ولی الحسن رضوی

امام رضا علیہ السلام کا دور

جب بات امام رضا علیہ السلام تک پہونچتی ہے حالات دوبارہ بہتر ہو جاتے ہیں۔ امامؑ کو نسبتاً سکون کے ساتھ تبلیغ و اشاعت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ ہر طرف شیعہ پھیلتے نظر آتے ہیں، امکانات میں بھی اتنی فراوانی پیدا ہو جاتی ہے کہ مسئلہ امامؑ کی ولی عہدی پر جا کر منتہی ہوتا ہے اگر چہ جب تک ہارون بقید حیات رہا امام ہشتمؑ کو بھی خاموشی اور تقیہ کی زندگی بسر کرنی پڑی پھر بھی آپ کی جدوجہد اور سیاسی مہم جاری رہتی ہے، اسلامی تحریک اور تبلیغ و ابلاغ میں خلل پیدا نہیں ہو سکا گو کہ یہ سارے کام مکمل احتیاط کے ساتھ خفیہ طور پر انجام پاتے ہیں ــــ انسان سمجھ سکتا ہے مثال کے طور پر دعبل خزاعی کا حضرتؑ کی ولی عہدی کے دوران ان الفاظ میں مدح سرائی کرنا ظاہر ہے یہ چیز یکایک زمین سے نہیں برآمد ہو گئی تھی ـــــ وہ معاشرہ جس میں دعبل خزاعی جیسی شخصیت پرورش پا رہی ہو اور ابراہیم ابن عباس جو حضرت کے مداحوں میں سے ہیں یا اسی قسم کے دوسرے کئی افراد جہاں موجود ہوں اس کی ثقافت و معاشرت میں خاندان رسول کے ساتھ محبت و ارادت کا عنصر موجود ہونا ایک بدیہی سی بات ہے ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی بنیاد کے دفعتاً مدینہ، خراسان، رَے نیز دیگر دور دراز علاقوں میں لوگ امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا جشن منانے لگتے ہیں سوائے اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ پہلے سے اس طرح کے نقوش مرتب ہو رہے تھے۔ وہ حالات و واقعات جو امام علیہ السلام کی ولی عہدی کے دوران پیش آتے ہیں (بڑی اہمیت کے حامل ہیں) ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت کی ولی عہدی کے دوران عوام کے جوش و جذبات، اہلبیتؑ کی محبت و عقیدت کے سلسلہ میں بڑی اونچی سطح پر پہونچ چکے تھے۔ بہر حال بعد میں امین اور مامون کے درمیان شدید اختلاف کی وجہ سے بغداد و خراسان کے درمیان پانچ سال تک جنگ و جدال کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور یہ چیز امام رضا علیہ السلام کے لیئے اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ولی عہدی کے ساتھ اپنی انتہا کو پہونچ جاتا ہے افسوس بس اس بات کا ہے کہ یہاں بھی امامؑ کی شہادت کی وجہ سے رشتۂ رشد و ہدایت قطع ہو جاتا ہے اور ایک بار پھر ایک نئے دور سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو اہلبیتؑ کے لیئے جانفشانی اور غم و آلام کا دور کہا جا سکتا ہے۔ میری نظر میں امام جواد علیہ السلام اور آپ کے بعد کا دور اہلبیت علیہم السلام کے لیئے ہمیشہ سے زیادہ بدتر دور رہا ہے اور اس میں

ان حضرات کو سب سے زیادہ محنت و جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی کا مجموعی خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کر دیا تھا کہ میں اپنی بحث کو دو حصوں میں منقسم کر رہا ہوں جس کا ایک حصہ یہی مجموعی سیاسی خاکہ تھا جو اس منزل پر تمام ہو جاتا ہے۔ اب رہی دوسرے حصہ کی بات جو ائمہ علیہم السلام کی اس سیاسی جدوجہد کے نمود و اثرات سے متعلق ہے۔ اس وقت شاید اس سلسلہ میں تفصیلی بحث نہ ہو سکے لیکن وہ چیز جو میں نے محسوس کی ہے اور ادھر وقت نکال کر دو ایک روز اس پر کام کر سکا ہوں محض عنوان کے طور پر یہاں ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ ذہن میں رہے کہ تمام قابل بحث عنوانات میں نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیئے نمونہ کے طور پر صرف چند عنوانات حاضر خدمت ہیں۔

ائمہ کی سیاسی جدوجہد کے نمود و آثار

ان میں سے ایک مسئلہ ''امامت کا ادعا اور اس کی طرف دعوت'' ہے جو ائمہ کی زندگی میں جگہ جگہ نظر آتا ہے اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کا یہی بنیادی محور ہے۔ دراصل یہ ایک مبسوط فصل ہے جس کے ذیل میں مختلف ابواب کے تحت روایات موجود ہیں منجملہ اس کے کافی کی روایت: ''الائمة نور اللّٰہ . . . '' امامت کی معرفی کے ذیل میں امام ہشتمؑ کی روایت نیز صادق اہلبیت طہارتؑ سے مروی مختلف روایات اور طرح طرح کے مخالفین سے آپ کے اصحاب کے مجادلے، اس کے علاوہ اہل عراق کو دعوت دیتے ہوئے امام حسینؑ کی زندگی سے متعلق روایات غرضیکہ اس موضوع پر بہت سی روایتیں موجود ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ کی کوششوں اور دعوؤں سے خلفائے وقت کیا سمجھتے تھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے لے کر متوکل عباسی کے دور تک مسلسل طور پر ائمہ کے مقاصد اور منصوبوں کے سلسلہ میں ایک ہی فکر و خیال پایا جاتا ہے۔

ہمیشہ خلفاء اور ان کے عمال و کارندے ائمہ علیہم السلام کو ایک ہی نظر سے دیکھتے رہے اور قہری طور پر ائمہ کے بارہ میں ان کی طرف سے ایک ہی انداز کا فیصلہ صادر ہوتا رہا ہے۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بآسانی اس سے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ ائمہ کے سلسلہ میں ان سب کا ایک ہی نظریہ کیوں ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مثال کے طور پر امام ہفتم موسیٰ ابن جعفرؑ کے سلسلہ میں یہ کہا جانا کہ ''**خلیفتان یجبی الیهما الخراج**۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' یا امام ہشتم علی رضا علیہ السلام کے لیئے یہ جملہ: ''**هٰذا علی ابنه قد قعد و ادعی الامر لنفسه**۔۔۔۔۔۔۔'' یا دیگر ائمہؑ کے بارہ میں اسی قسم کے جملے اس بات کی واضح نشان دہی کرتے ہیں کہ خلفائے وقت اور ان کے رفقائے کار ائمہ کی زندگی سے کس قسم کے دعووں کا استنباط کرتے تھے۔ یہ نہایت ہی قابل توجہ اور اہم ترین نکتہ ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ خلفائے وقت کا اپنی امامت پر اصرار اور شیعیان آل محمدؐ کا اس امر کی نزاکت کے پیش نظر

مسلسل اس کی مخالفت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ جس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: کثیرؔ جو دور بنوامیہ کے پہلے دور کے صف اول کے شعراء (یعنی فرزدقؔ، جریرؔ، اخطل، جمیلؔ اور نصیبؔ وغیرہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے) شیعہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کے عقیدتمندوں میں سے ہے ایک دن امام پنجم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، امام علیہ السلام شکایت کے لہجہ میں اس سے سوال کرتے ہیں: **امتدحت عبد الملک؟** میں نے سنا ہے کہ تم نے عبدالملک کی مدح سرائی کی ہے؟! وہ ایک دم گھبرا کر امام سے عرض کرتا ہے: **یابن رسول الله ماقلت له** ''یا امام الھدیٰ'' اے فرزند رسولؐ میں نے اس کو امام ہدیٰ تو نہیں کہا ہے'' **وانما قلت له اسد والاسد کلب و یا شمس والشمس جماد و یا بحر والبحر موات۔۔۔۔۔**'' ہاں میں نے اس کو شیر، سورج، سمندر، پہاڑ اور اژدہا جیسے خطابات سے ضرور نوازا ہے اور کسی کے لیئے درندہ ہونا یا جماد سے قرار دیا جانا وغیرہ کوئی فضیلت کی بات تو نہیں ہے۔ اس طرح امامؑ کے سامنے کثیرؔ اپنے عمل کی توجیہ پیش کرتا ہے کہ امام کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور تب شاعر آل محمد کمیتؔ اسدی اٹھتا ہے اور اپنا وہ ''قصیدہ ہاشمیہ'' سناتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

من لقلب میتم مستھام غیر ماصبوة ولا احلام

یہاں تک کہ وہ اس شعر پر پہنچتا ہے:

ساسة لا لکمن یریٰ رعیة الناس

سواء و رعیة الانعام

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام عبد الملک جیسے کی مدح کے سلسلہ میں کتنے حساس تھے اور دوسری طرف کثیر کے مثل آپ کے دوستوں کی حساسیت ''امام الہدیٰ'' پر مرکوز تھی تو وہ فوراً کہتا ہے کہ مولا! میں نے عبد الملک کو امام الہدیٰ نہیں کہا ہے —اور یہی واقعہ اس بات کی بھی صاف نشان دہی کرتا ہے کہ خلفائے وقت کو اپنے امام الہدیٰ کہے جانے کی کتنی تمنا تھی۔ چنانچہ بنوعباس کے یہاں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لیتا ہے —— مروان ابن ابی حفصہ اموی جسکو بنو امیہ اور بنو عباس دونوں درباروں کی غلامی اور مداحی کا فخر حاصل ہے (جی ہاں! یہی تو عجیب چیز ہے یہ شخص بنوامیہ کے زمانہ میں درباری شاعر تھا اور جب بنوعباس برسر اقتدار آئے تو ان کا بھی درباری شاعر بن گیا!! چونکہ اس کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی لہٰذا بنوعباس نے بھی اس کو پیسوں کے ذریعہ خرید لیا) چنانچہ جب یہ بنوعباس کی مدح سرائی پر کمر باندھتا ہے تو یہ ان کی شجاعت و کرم جیسی عامیانہ مدح پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کی پیغمبر اسلام کے ساتھ قرابت داری کی بنیاد پر انہیں اس مقام و مرتبہ تک پہونچا دیتا ہے جس کے وہ دیرینہ متمنی تھے۔ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:۔

انی یکون ولیس ذاک بکائن

لبنی البنات وراثة الاعمام

یعنی یہ چیز کیسے ممکن ہے کہ دختر زادے چچا کی میراث کے حقدار بن جائیں؟ کیا کہنا! پیغمبر کے چچا عباس کی میراث نہیں معلوم یہ دختر زادے (اولاد فاطمہؑ) کیوں

ہڑپ کر لینا چاہتے ہیں!!

آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ سارا جھگڑا حق خلافت کے مسئلہ پر ہے اور حقیقتاً یہی سیاسی وثقافتی جنگ رہی ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں مشہور ومعروف شیعہ طائی شاعر، جعفر بن عفان کہتا ہے:۔

لم لا یکون ؟ و ان ذاک لکائن
لبنی البنات وراثة الاعمام
للبنت نصف کامل من ماله
والعم متروک بغیر سهام

یعنی بیٹی اپنے باپ کے نصف مال کی وارث ہوتی ہے اور بیٹی کی موجودگی میں چچا کا مرنے کے والے کے ترکہ میں کچھ بھی حق نہیں ہوتا لہٰذا میراث میں تمہارا حق ہی کیا ہے جو طلب کر رہے ہو۔

اس واقعہ سے بھی امامت کے مسئلہ میں شیعیان آل محمدؐ کی حساسیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسئلہ ائمہ علیہم السلام کی طرف سے خونین جد وجہد کی تائید وحمایت ہے جس کا شمار ائمہ کی زندگی سے متعلق گرما گرم بحثوں میں ہوتا ہے اور ائمہ کی سیاسی جد وجہد کی پالیسی کی حکایت کرتا ہے۔مثلاً معلیٰ بن خنیس جس وقت داؤد بن علی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں اس وقت کے امام جعفر صادقؑ کے تاثرات و اظہارات ملاحظہ فرمائیں یا اسی طرح جناب زید شہید، سید الشہداءامام حسین علیہ السلام، شہید فخ نیز بعض دوسرے حضرات کے سلسلہ میں امام علیہ السلام کے ارشادات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ''نور الثقلین'' میں ایک عجیب و غریب روایت دیکھی، یہ روایت علی ابن عقبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:۔

''ان ابی قال دخلت انا والمعلی علی ابی عبدالله (ع) فقال (ع): ابشروا انتم علی احدی الحسنیین شفی الله صدورکم و اذهب غیظ قلوبکم وانالکم من عدوکم وهو قول الله تعالیٰ و یشف صدور قوم مومنین و ان مضیتم قبل ان یروا ذلک مضیتم علیٰ دین الله الذی رضیه لنبیه (ص) ولعلی (ع)''

میں اور معلیٰ ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرتؑ نے فرمایا: تم لوگوں کو بشارت ہو کہ دو میں سے ایک نیک ترین انجام (کامیابی یا شہادت) تمہارا منتظر ہے خداوند عالم نے تمہارے سینوں کو شفا عطا کیا (یا کرے) اور تمہارے دلوں کے غیظ وغضب کو ٹھنڈے کردئے (یا کرے) اور تم کو دشمنوں پر مسلط کردیا (یا کرے) اور یہی وعدۂ الٰہی ہے جو خدا نے (مومنین سے) کیا ہے ''ویشف صدور قوم مومنین''، قبل اس کے کہ یہ کامیابی تمہارے قدم چومے اگر تم دنیا سے رخصت ہوجاتے (یا رخصت ہوجاؤ) تو تمہاری قربانی خدا کے اس دین کے لیئے ہے (یا ہوگی) جس کو پروردگار نے اپنی نبی (محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور علی (علیہ السلام) کے لیئے پسند فرمایا ہے۔

یہ روایت اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جہاد ومبارزہ، کامیابی وکامرانی اور قتل کرنے اور قتل

کردئے جانے کے سلسلہ میں بات کی گئی ہے۔ بالخصوص اس میں معلیٰ بن خنیس مخاطب ہیں جن کے واقعہ سے ہم سب واقف ہیں۔ امام علیہ السلام بغیر کسی تمہید ومقدمہ کے بات شروع کردیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ امامؑ کسی خاص چیز یا حادثہ سے متعلق گفتگو کررہے ہیں جبکہ کسی کو حادثہ کا علم نہیں ہے۔ ممکن ہے ''شفی اللہ صدورکم'' تا آخر کی عبارت امام علیہ السلام نے دعا کے طور پر ارشاد فرمائی ہو اور زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ امام کسی پیش آئے ہوئے واقعہ کی خبر دے رہے ہوں تو آیا یہ دونوں حضرات کسی مہم سے واپس ہوئے تھے جس کی حضرت کو خبر تھی یا ہوسکتا ہے کہ خود امامؑ نے ان کو اس مہم پر مامور کیا ہو؟

کچھ بھی ہو حدیث کا لب ولہجہ ان میں سے ہر دو معنی و احتمال کی بنیاد پر واضح طور پر بتاتا ہے کہ امام علیہ السلام اس تیز وتند اور مخاصمت آمیز طریقہ کار کے حامی تھے جو معلیٰ بن خنیس کی روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے اور یہ چیز بھی توجہ کے قابل ہے کہ معلیٰ امام صادقؑ کے ''باب'' ہیں اور یہ ''باب'' کی تعبیر خود اپنی جگہ پر ایک مستقل فکر وتحقیق کا موضوع ہے۔

وہ حضرات جو روایات میں ائمہ علیہم السلام کے ''باب'' کے طور پر پیش کئے گئے کون لوگ ہیں؟ جبکہ ان میں سے زیادہ تعداد ان کی ہے جو یا تو مقتول ہیں یا جن کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے؟ مثال کے طور پر یحییٰ بن ام الطویل، معلیٰ بن خنیس، جابر بن یزید جعفی۔۔۔۔وغیرہ

ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے متعلق ایک اور بحث ان کا قید خانوں میں رکھا جانا، گھر سے دربدر کیا جانا اور انھیں زیر نظر رکھا جانا بھی ہے اور میری نظر میں یہ موضوع بہت زیادہ تحقیق وتدقیق کا طالب ہے کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سے مطالب تحقیق و دقت نظر کے محتاج ہیں اور دامن وقت میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی خاطرخواہ بحث کرسکوں۔

ایک اور مسئلہ خلفا کے مقابلہ میں ائمہ علیہم السلام کا بےخوف وخطر، صاف وصریح بے باک رویہ ہے اور اس بحث کے ذیل میں قابل غور وفکر نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ حضرات بھی معاذ اللہ دبو، مفاہمت پسند اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والے ہوتے تو اپنے دور کے دوسرے علماء وزہاد کی طرح کسی مخالفانہ لب ولہجہ کے بجائے نرم وشیرین انداز کلام کا انتخاب کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے علماء وزہاد موجود تھے جن سے خلفاء نہ صرف علاقہ ومحبت بلکہ ارادت بھی رکھتے تھے۔ ہارون کہتا تھا ؎

کلکم یمشی روید کلکم یطلب صید
غیر عمرو بن عبید

یہ لوگ خلفاء کو نصیحتیں بھی کرتے ہیں حتی کہ کبھی کبھی ان کو رلاتے بھی ہیں پھر بھی یہ حضرات خلفاء کو ظالم وجابر اور طاغی وغاصب یا شیطان اور اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ذریعہ یاد کرنے سے احتراز واحتیاط برتتے ہیں اس کے برخلاف ائمہ علیہم السلام ایسی کوئی رعایت نہیں کرتے حقائق کا برملا اظہار فرمادیتے ہیں، ارباب حکومت کے ظاہری جاہ و

حشم اور سطوت وہیبت ان کی زبانیں بند نہ کرسکی۔

ایک اور بحث ائمہ علیہم السلام کے ساتھ خلفائے وقت کی معاندانہ روش ہے مثال کے طور پر امام صادقؑ اور منصور کے درمیان نیز امام کاظمؑ اور ہارون کے درمیان جو حادثات وواقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور جن میں سے دو ایک نمونے ہم نے اشارہ کے طور پر ذکر بھی کئے ہیں۔

امامت کی حکمت عملی

ایک دوسری بحث جو پورے طور پر قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہے، ائمہ علیہم السلام کے بے باک دعوے ہیں جن سے امامت کی بنیادی حکمت عملی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں ائمہؑ کے ارشادات ومباحثات میں اس طرح کے دعوے اور بیانات نظر آتے ہیں جو عام انداز سے بالکل مختلف ہیں اور ایک خاص مقصد وراہ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی واقعات سے امامت کی صحیح حکمت عملی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی موارد میں سے ایک وہ موقع ہے جب حضرت موسی

ہارون امام علیہ السلام سے کہتا ہے: **حد فدکا حتی اردها الیک** فدک کے حدود معین کر دیجئے تاکہ اسے ہم آپ کو واپس کر دیں۔

اس کا خیال تھا کہ اس طرح فدک کا نعرہ جو ہمیشہ تاریخ میں اہلبیت علیہم السلام کی مظلومیت کے عنوان سے دوہرایا جاتا رہا ہے اس کو بے اثر بنادے اور ذریت رسولؐ سے ان کا یہ ہتھیار چھین لے اور شاید اس طرح شیعوں کے ذہنوں میں اپنے اور غاصبین فدک کے درمیان فرق جتانا بھی مقصود رہا ہو چنانچہ حضرتؑ پہلے تو اس کی پیشکش کو رد کردیتے ہیں اور جب اس کی طرف سے اصرار بڑھتا ہے تو امام علیہ السلام فرماتے ہیں: ''**لا اخذها الا بحدودها**'' اگر فدک واپس ہی کرنا ہے تو اس کی واقعی حدود کے ساتھ واپس کرو۔ ہارون قبول کرلیتا ہے تو امامؑ حدود فدک معین فرمانا شروع کردیتے ہیں:-

''**اما الحد الاول فعدن**'' اس کی پہلی حد، عدن ہے

یہ گفتگو مدینہ یا بغداد میں ہو رہی ہے —امام جزیرۂ عرب کی آخری سرحد عدن کو فدک کی ایک حد کے طور پر معین کر رہے ہیں۔

''**فتغیر وجه الرشید و قال: ایها**'' ہارون رشید کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے۔ اوہ!

حضرت فرماتے ہیں: ''**والحد الثانی سمرقند**'' اس کی دوسری حد سمرقند ہے۔ مشرق میں ہارون کی سلطنت یہیں منتہی ہوتی تھی۔

''**فاربد وجهه**'' ہارون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔

امامؑ فرماتے ہیں: ''**والحد الثالث افریقیه**'' اور اس کی تیسری حد ٹیونس سے ملتی ہے۔ یہ عباسی حکومت کی مغربی سرحد ہے۔

''**فاسود وجهه و قال: هیه**'' ہارون کا چہرہ غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے: اچھا؟!! امامؑ اپنی

بات جاری رکھتے ہیں ''**والحد الرابع سیف البحر مما یلی الجزر و ارمینیه**'' اور اس کی چوتھی سمت سمندر کے کناروں سے ملتی ہے جس کی پشت پر جزیرے اور ارمنستان ہیں۔ یہ ملک کا آخری شمالی حصہ ہے۔

اب ہارون کا پارہ آخری نقطہ پر پہونچ چکا تھا کھسا ہیٹ اور غصہ کے عالم میں کہتا ہے: **فلم یبقی لنا شئ فتحول الیٰ مجلسی**!! پس ہمارے لیئے کیا بچتا ہے اٹھئے اور میری جگہ بیٹھ جایئے۔قال موسیٰ '**قد اعلمتک اننی ان حددتها لن تردها**'' امامؑ نے فرمایا : میں نے پہلے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے فدک کی حدیں بیان کر دیں تو کبھی واپس نہ کرے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ''**فعند ذلک عزم علیٰ قتله**''یعنی یہی وہ منزل تھی جب ہارون امامؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے۔

اس پوری گفتگو میں واضح ترین چیز امام علیہ السلام کا ادعا ہے وہ چیز جس کو ہارون نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قتل پر کمر بستہ ہو گیا۔ اور اسی قبیل کے اظہارات جس سے ائمہ علیہم السلام کے دعوؤں کا صاف پتہ چلتا ہے امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام رضاؑ کی زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں جن کو اگر یکجا کر دیا جائے تو امامت کا موقف واضح طور پر سامنے آجائے۔

ائمہؑ کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں ان کے اصحاب کا نظریہ

ائمہؑ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور مسئلہ جس کی تحقیق اور چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ائمہؑ کے مقاصد ان کے طریقۂ کار اور مدعا کے سلسلہ میں ائمہؑ کے اصحاب کیا نظریہ رکھتے تھے، اس کا جائزہ لیا جائے۔ بدیہی سی بات ہے کہ ہمارے مقابلہ میں اصحاب ائمہؑ ان بزرگواروں سے زیادہ نزدیک بھی تھے اور ان کے مقصد ومدعا سے زیادہ واقف وآگاہ بھی تھے تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے کیا تاثرات تھے اور وہ اس کی کیا تفسیر کرتے تھے؟ کیا روایات سے اس نکتہ کی وضاحت نہیں ہوتی کہ خود اصحاب بھی قیام وخروج کے منتظر تھے؟ خراسان کے اس شخص کی داستان سے کون ناواقف ہے جو امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ کئی لاکھ مسلح افراد وارد میدان ہونے کے سلسلہ میں آپ کے اشارہ کے منتظر ہیں۔ جب حضرت مذکورہ اعداد وشمار پر تعجب فرماتے ہیں تو وہ پے در پے اعداد میں کمی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ بات کو ختم کرتے ہوئے امامؑ اپنے اصحاب اور انصار کے اوصاف بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اگر اس طرح کے اتنے (۱۲، ۱۵ یا ...... افراد اختلاف روایات کے ساتھ) مجھے میسر ہوتے تو میں میدان میں آجاتا۔

اس طرح کے بہت سے افراد امام کے پاس آکر قیام کا تقاضہ کرتے رہے ہیں (روایات میں خروج کا لفظ استعمال ہوا ہے البتہ بعض موارد میں امامؑ سے قیام کا مطالبہ کرنے والوں میں عباسی حکومت کے جاسوس بھی ملتے ہیں جس کا اندازہ امامؑ کی جانب سے ان کو دئے جانے والے جوابات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے)

آخر یہ افراد امامؑ کی خدمت میں اس قسم کا مطالبہ لے کر کیوں حاضر ہو رہے تھے؟ کیا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ اس وقت شیعوں کے درمیان حق و انصاف پر مبنی حکومت کی تاسیس کے لیئے قیام و خروج ایک حتمی اور ائمہؑ کے مقاصد سے ہم آہنگ امر شمار ہوتا تھا چنانچہ ائمہ علیہم السلام کے اصحاب و انصار میں یہ بات مشہور تھی کہ امامؑ کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ روایت نظر سے گذری جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زرارہ ابن اعین جیسے بلند مرتبہ صحابی بھی اس سلسلہ میں کیا نظریہ رکھتے تھے۔ رجال کشی میں روایت ہے: ایک دن زرارہ امامؑ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص اپنی تلاش میں سرگرم دشمن کے ہاتھوں سے بھاگ نکلا ہے اگر ''یہ امر'' (حکومت کے لیئے قیام) نزدیک ہو تو وہ صبر کرے تاکہ قیام کرنے والوں کے ساتھ خروج کرے اور اگر اس میں تاخیر ہو تو وہ مصالحت کر لے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں: ''وہ وقت آئے گا'' زرارہ سوال کرتے ہیں: کیا ایک سال کے اندر ایسا ہوگا؟ امامؑ فرماتے ہیں: ''انشاء اللہ وہ وقت آئے گا'' زرارہ پھر پوچھتے ہیں: کیا دو سال لگ جائے گا؟ امامؑ اپنا جملہ دہرا دیتے ہیں: ''انشاء اللہ وہ وقت آئے گا'' اور زرارہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ دو سال تک آل علیؑ کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

یقیناً زرارہ سادہ لوح و بے اطلاع افراد میں سے نہ تھے وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے قریب ترین اصحاب میں سے تھے ان کا اس قدر قریب ترین زمانہ میں حکومت علوی کی تشکیل کا اندازہ لگانا ظاہر ہے بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسری روایت میں ہشام ابن سالم نقل کرتے ہیں کہ ایک روز زرارہ نے مجھ سے کہا: **لا تریٰ علیٰ اعوادھا غیر جعفر** (ع) مسند خلافت پر امام جعفرؑ ابن محمدؑ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھو گے۔ ہشام کہتے ہیں جب امام صادقؑ نے شہادت پائی تو میں نے زرارہ سے کہا: ''کیا تم کو اپنی وہ بات یاد ہے؟'' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھول نہ گئے ہوں مگر زرارہ نے کہا: ہاں مگر خدا کی قسم میں نے وہ بات اپنے اندازہ کے مطابق کہی تھی (مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ زرارہ نے وہ بات امام علیہ السلام سے نقل کی تھی)

متعدد روایتوں سے اصحاب ائمہؑ کی طرف سے قیام کی درخواست یا اس کے انتظار کا پتہ چلتا ہے اور اس سے اس بات کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ ائمہ علیہم السلام کا ہدف و مقصد یعنی حکومت علوی کی تشکیل، اس کے لیئے تلاش و جستجو اور اس کا متوقع ہونا شیعیان آل محمد حتیٰ کہ ائمہؑ کے قریب ترین ساتھیوں کے درمیان مسلمات میں شمار ہوتا تھا اور یہ چیز ائمہؑ کے ہدف و حکمت عملی کا ایک قطعی قرینہ ہے۔

ایک دوسری بحث یہ ہے کہ ائمہ کے ساتھ خلفائے وقت کے بغض و عناد اور خصومت و دشمنی کی علت کیا تھی؟ آیا ان کے حسد کی وجہ محض ائمہؑ کی معنوی عظمت اور عوام میں ہر دل عزیزی تھی اور ان تمام دشمنیوں کی اصل بنیاد یہی چیز تھی؟ یا حقیقت امر کچھ اور ہے؟

یقیناً اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ائمہ علیہم السلام خلفاء نیز اس طرح کے دوسرے افراد کے حسد کا نشانہ رہے ہیں کہ جیسا کہ قرآن کی آیت: **ام یحسدون الناس علی ما آتیھم اللہ من فضلہ** کی تفسیر کے ذیل میں اس مضمون کی روایت موجود ہے کہ ''**نحن المحسودون**'' یعنی وہ لوگ جن سے لوگوں کا حسد کرنا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ہم لوگ ہیں۔ پھر بھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ ائمہؑ کے ساتھ لوگوں کے حسد کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے علم وتقویٰ سے لوگ حسد کرتے تھے؟ تو یہ سبھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے علماء وزہاد بھی موجود تھے جو انہی صفات کے ساتھ لوگوں میں پہچانے جاتے تھے اور ان کے چاہنے والوں اور دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ابوحنیفہ، ابویوسف، حسن بصری، سفیان ثوری، محمد بن شہاب اور اسی طرح کے دسیوں مشہور ومعروف چہرے اس وقت موجود تھے، جن کے بڑی تعداد میں مطیع وخیرخواہ موجود تھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کے درمیان مشہور تھے بلکہ ان کے محبوب بھی تھے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خلفاء نے نہ فقط یہ کہ ان کے ساتھ بغض وحسد کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض خلفا کی محبت وارادت کے مرکز بھی رہے ہیں۔

لہٰذا ہماری نظر میں ائمہؑ کے ساتھ خلفاء کی ایسی شدید دشمنی جو گرفتاری، دربدری، قید وبند اور پھر شہادت پر منتہی ہوتی ہے اس کی اصل علت کسی اور ہی چیز میں تلاش کرنی چاہیے۔ اور وہ خلافت وامامت کے سلسلہ میں ان حضراتؑ کا ادعا ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں نظر آتا۔ یہ ان ہی بحثوں میں سے ایک بحث ہے جس پر تحقیق وتدقیق کئے جانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ایک تحقیق طلب موضوع ائمہ علیہم السلام کے اصحاب کا آستانۂ خلافت کے ساتھ تیز وتند مقابلہ اور ٹکراؤ ہے جس کے نمونے ائمہؑ کی زندگی کے دوران بخوبی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ حضرت سید سجادؑ کے زمانے میں جو سخت خفقان وگھٹن کا دور ہے یحییٰ بن ام طویل جو حضرت کے حوارئین میں سے تھے۔ مسجد مدینہ میں آتے تھے اور ان لوگوں سے جو یا تو دربار خلافت کے سامنے سر تسلیم خم کرچکے تھے یا خلافت کے کارگزاروں میں سے تھے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی وہ آیت پڑھتے تھے جس میں کفار سے جناب ابراہیمؑ کی گفتگو کا ذکر ہے: ''**کفرنا بکم وبدأ بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء...**'' اور اسی طرح کناسۂ کوفہ میں مجمع عام میں شیعوں کے ایک گروہ کو خطاب کرتے ہوئے بآواز بلند ایسی تقریر کرتے ہیں جس کا لفظ لفظ حکام وقت کی سیاست کے لیئے کھلا ہوا چیلنج تھا۔

معلیٰ ابن خنیس نماز عید کی ادائیگی کے لیئے جب لوگوں کے ہمراہ صحرا کی جانب جاتے تھے تو نہایت ہی پریشاں حال غیر مرتب لباس میں غمگین صورت بنائے وہاں پہونچتے تھے اور جیسے ہی خطیب منبر پر جاتا تھا ہاتھوں کو بلند کرکے بآواز بلند کہتے تھے:'' **اللھم ان ھذا مقام خلفائک و اصفیائک و موضع امنائک ... ابتزوھا** '' پروردگارا! یہ منبر اور یہ مقام تیرے منتخب اور برگزیدہ جانشینوں کا ہے جو فی الحال ان سے چھین لیا گیا ہے

اور دوسروں نے اس پر اپنا پنجہ مضبوط کرلیا ہے۔

اور مقام افسوس ہے کہ یہ بلند مرتبہ صحابی جس کے قاتل پر امام صادق علیہ السلام لعن و نفرین کرتے ہوئے مقتول کی تعریف و توصیف فرماتے ہیں بعض افراد کی تنقید و بے مہری کا نشانہ بن کر ثقہ اور امین کی فہرست سے خارج کردئے گئے ہیں اور بعید نہیں ہے کہ اس فکر کے پیچھے بھی بنوعباس کا خبیث ہاتھ کارفرما ہو۔

ایک اور مسئلہ جس کے لیئے کافی دقت اور بحث عمیق کی ضرورت ہے، مسئلہ تقیہ ہے۔ اصل میں تقیہ کا مورد اور عنوان سمجھنے کے لیئے لازم ہے کہ وہ تمام روایات جو کتمان و پردہ داری نیز خفیہ سرگرمیوں سے متعلق ہیں ان کی چھان بین کی جائے تا کہ ایک طرف تو ائمہ علیہم السلام کے اس ادعا اور ہدف کے پیش نظر جن کا گذشتہ بحثوں میں ذکر کیا جاچکا ہے اور دسری طرف خلفائے زمانہ کے اس شدید ردعمل کے پیش نظر جو ائمہ علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی سرگرمی اور سیاسی فعالیت کے خلاف ظاہر ہوتا رہا ہے —— تقیہ کا صحیح اور حقیقی مفہوم سمجھا جاسکے۔

البتہ ایک چیز جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے وہ یہ کہ تقیہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے یا تمام کام اور سعی و کوشش ترک کردینے کا نام نہیں ہے بلکہ پوشیدہ طور پر حفاظت کا خیال رکھتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھنے کو تقیہ کہتے ہیں اور یہ بات بھرپور طور پر، روایتوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی روشن ہوجاتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ سے متعلق ضروری مباحث کا صرف ایک حصہ ہے ان بزرگان دین کی سیاسی زندگی سے مربوط بہت سی دوسری بحثیں بھی ہیں جن کی فہرست پیش کرنے کی بھی اب گنجائش نہیں ہے اگرچہ ان سے متعلق ضروری یادداشتیں میرے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔ بندہ نے ان تمام موضوعات موضوعات پر بڑی تفصیل کے ساتھ کام کیا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس وقت ان تمام چیزوں کو تدوین کرنے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے۔ اے کاش! ایسے باہمت افراد پیدا ہوجاتے جو اس کام کو آگے بڑھاتے اور ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی بھی یکجا صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جاتی اور ہم ان عظیم ہستیوں کی زندگی کے ان تمام روشن پہلوؤں کو اپنے لیے درس اور نمونے کے عنوان سے اختیار کرتے نہ یہ کہ صرف ایک زندہ و پایندہ یادگار کے طور پر اس کا ذکر کرلینا ہی کافی سمجھ لیتے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب علی بن شعیبؒ بن بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا:
اے علی! سب سے اچھی زندگی کس کی ہے؟—— میں نے عرض کیا مولا آپ بہتر جانتے ہیں —— اس وقت آپ نے فرمایا:
''جس کی بدولت دوسروں کی زندگی خوشگوار ہوجائے'' اور جانتے ہو زندگی کے لحاظ سے بدترین شخص کون ہے؟ میں نے پھر اپنی لاعلمی ظاہر کی تو آپ نے فرمایا: ''جس کی زندگی میں دوسروں کا کوئی حصہ نہ ہو —— اے علی! جو نعمتیں تمھیں عطا کی گئی ہیں ان کی قدر کرو اور یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، کیونکہ اگر ان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو دوبارہ ملنے کا بہت کم امکان ہے —— اے علی! بدترین شخص وہ ہے جس کی زندگی دوسروں کے لئے مفید نہ ہو۔ جو مہمانوں اور حاجت مندوں کی پروانہ کرتا ہوا کیلا کھاتا ہو اور اپنے ماتحت پر ظلم کرتا ہو۔

نویں امام

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

نام ونسب: محمد نام، ابوجعفر کنیت اور تقی وجواد دونوں مشہور لقب تھے۔ اسی لیے اسم ولقب کو شریک کرکے آپ امام محمد تقی علیہ السلام کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے پہلے امام محمد باقر علیہ السلام کی کنیت ابوجعفر ہوچکی تھی اس لیے کتابوں میں آپ کو ابوجعفر ثانی اور دوسرے لقب کو سامنے رکھ کر حضرت جواد بھی کہا جاتا ہے۔ والد بزرگوار آپ کے حضرت امام رضاؑ تھے اور والدۂ معظّمہ کا نام جناب سبیکہ یا سکینہ تھا۔

ولادت: ۱۰رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت بغداد کے دارالسلطنت میں ہارون رشید کا بیٹا امین تخت حکومت پر تھا۔

نشوونما اور تربیت: یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو نہایت کمسنی ہی کے زمانے میں مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجانا پڑا۔ انہیں بہت ہی کم اطمینان اور سکون کے لمحات باپ کی محبت، شفقت اور تربیت کے سایے میں زندگی گذارنے کا موقع مل سکا۔ آپ کو صرف پانچواں برس تھا جب حضرت امام رضا علیہ السلام مدینہ سے خراسان کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوئے۔ امام محمد تقی علیہ السلام اس وقت سے جو اپنے باپ سے جدا ہوئے تو پھر زندگی میں ملاقات کا موقع نہ ملا۔ امام محمد تقیؑ سے جدا ہونے کے تیسرے سال امام رضاؑ کی وفات ہوگئی۔ دنیا سمجھتی ہوگی کہ امام محمد تقیؑ کے لیے علمی اور عملی بلندیوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اس لیے اب امام جعفر صادقؑ کی علمی مسند شاید خالی نظر آئے۔ مگر خلق خدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کمسن بچے کو تھوڑے دن بعد مامون کے پہلو میں بیٹھکر بڑے بڑے علماء سے فقہ، حدیث، تفسیر اور کلام پر مناظرے کرتے اور سب کو قائل ہوجاتے دیکھا۔ ان کی حیرت اس وقت تک دور ہونا ممکن نہ تھی جب تک وہ مادی اسباب کے آگے ایک مخصوص خداوندی مدرسہ تعلیم وتربیت کے قائل نہ ہوتے جس کے بغیر یہ معمہ نہ حل ہوا اور نہ کبھی حل ہوسکتا ہے۔

عراق کا پہلا سفر: جب امام رضا علیہ السلام کو مامون نے ولی عہد بنایا اور اس کی سیاست اسکی مقتضی ہوئی کہ بنی عباس کو چھوڑ کر بنی فاطمہ سے روابط قائم کیے جائیں اور اس طرح شیعیان اہل بیتؑ کو اپنی جانب مائل کیا جائے تو اس نے ضرورت محسوس کی کہ خلوص واتحاد کے مظاہرے کے لیے علاوہ اس قدیم رشتے کے جو ہاشمی خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے ہے کچھ جدید رشتوں کی بنیاد بھی قائم کردی جائے۔

چنانچہ اسی جلسہ میں جہاں ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی اس نے اپنی بہن ام حبیبہ کا عقد امام رضاؑ کے ساتھ کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل کی نسبت کا امام محمد تقیؑ کے ساتھ اعلان کیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ اس طرح امام رضا بالکل اپنے بنائے جا سکیں گے ۔مگر جب اس نے محسوس کیا کہ یہ اپنے ان منصبی فرائض کو جو رسولؐ کے ورثہ دار ہونے کی بنا پر ان کے ذمہ ہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے اور اب عباسی سلطنت کا رکن ہونے کے ساتھ ان اصول پر قائم رہنا مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے تو اسے اپنے مفاد سلطنت کے تحفظ کی خاطر اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ زہر دے کر حضرت کی زندگی کا خاتمہ کر دے ۔مگر وہ مصلحت جو امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کی تھی یعنی ایرانی قوم اور جماعت شیعہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا وہ اب بھی باقی تھی اس لیے ایک طرف تو امام رضاؑ کے انتقال پر اس نے غیر معمولی رنج و غم کا اظہار کیا تا کہ وہ اپنے دامن کو حضرت کے خون ناحق سے الگ ثابت کر سکے اور دوسری طرف اس نے اپنے اس اعلان کی تکمیل ضروری سمجھی جو وہ امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کے منسوب کرنے کا کر چکا تھا۔ اس نے اس مقصد سے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے عراق کی طرف بلوایا اس لیے کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد وہ خود خراسان سے اب اپنے خاندان کے پرانے دارالسلطنت بغداد میں آ چکا تھا اور اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ ام الفضل کا عقد اس صاحبزادے کے ساتھ بہت جلد کر دے۔

علماء سے مناظرہ: بنی عباس کو مامون کی طرف سے امام رضاؑ کا ولی عہد بنایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا۔ امام رضاؑ کی وفات سے ایک حد تک انہیں اطمینان حاصل ہوا تھا اور انہوں نے مامون سے اپنے حسب دلخواہ اس کے بھائی موتمن کی ولی عہدی کا اعلان بھی کرا دیا جو بعد میں معتصم باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے زمانے میں عباسیوں کا مخصوص شعار یعنی کالا لباس ترک ہو کر جو سبز لباس کا رواج ہو رہا تھا اسے منسوخ کر کے پھر سیاہ لباس کی پابندی عائد کر دی گئی تا کہ بنی عباس کے روایات قدیمہ محفوظ رہیں۔ یہ سب باتیں عباسیوں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ مامون پر پورا قابو پا چکے ہیں مگر اب مامون کا یہ ارادہ کہ وہ امام محمد تقیؑ کو اپنا داماد بنائے ان لوگوں کے لیے پھر تشویش کا باعث بنا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے دلی رجحان کو دل میں نہ رکھ سکے اور ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آ کر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ امام رضاؑ کے ساتھ جو آپ نے طریقہ کار اختیار کیا وہی ہم کو ناپسند تھا مگر خیر وہ کم از کم اپنی عمر و اوصاف و کمالات کے لحاظ سے قابل عزت سمجھے بھی جا سکتے تھے مگر یہ ان کے بیٹے محمدؑ تو ابھی بالکل کم سن ہیں ایک بچے کو بڑے بڑے علماء اور معززین پر ترجیح دینا اور اس قدر اس کی عزت کرنا خلیفہ کے لیے زیبا نہیں ہے۔ پھر ام حبیبہ کا نکاح جو امام رضاؑ کے ساتھ کیا گیا تھا اس سے ہم کو کیا فائدہ پہونچا جو اب ام الفضل کا نکاح بھی محمد ابن علیؑ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

مامون نے اس تمام تقریر کا یہ جواب دیا کہ محمد کمسن ضرور ہیں مگر میں نے خوب اندازہ کر لیا ہے کہ اوصاف

وکمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جن کا تم حوالہ دے رہے ہو علم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو امتحان لے کر دیکھ لو۔ پھر تمہیں بھی میرے فیصلے سے متفق ہونا پڑے گا۔ یہ صرف منصفانہ جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا جس پر مجبوراً ان لوگوں کو مناظرے کی دعوت منظور کرنا پڑی حالانکہ خود مامون تمام سلاطین بنی عباس میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ مورخین اس کے لیے یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں کان **یعد من کبار الفقهاء** یعنی اس کا شمار بڑے فقیہوں میں ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ کچھ کم وقعت نہ رکھتا تھا مگر ان لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ ابن اکثم کو امام محمد تقی علیہ السلام سے بحث کے لیے منتخب کیا۔

مامون نے ایک عظیم الشان جلسہ اس مناظرے کے لیے منعقد کیا اور عام اعلان کروا دیا۔ ہر شخص اس عجیب اور بظاہر غیر متوازی مقابلے کے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا جس میں ایک طرف ایک آٹھ برس کا بچہ تھا اور دوسری طرف ایک آزمودہ کار اور شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر طرف سے خلائق کا ہجوم ہو گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ ارکان دولت اور معززین کے علاوہ اس جلسے میں نو سو کرسیاں فقط علماء و فضلاء کے لیے مخصوص تھیں اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں اس لیے کہ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے شباب اور بالخصوص علمی ترقی کے اعتبار سے زرّین دور تھا اور بغداد دارالسلطنت تھا جہاں تمام اطراف سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کھنچ کر جمع ہو گئے تھے اس اعتبار سے یہ تعداد کسی مبالغہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتی۔

مامون نے حضرت امام محمد تقیؑ کے لیے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی تھی اور حضرت کے سامنے یحییٰ ابن اکثم کے لیے بیٹھنے کی جگہ تھی ہر طرف کامل سناٹا تھا۔ مجمع ہمہ تن چشم و گوش بنا ہوا گفتگو شروع ہونے کے وقت کا منتظر ہی تھا کہ اس خاموشی کو یحییٰ کے اس سوال نے توڑ دیا جو اس نے مامون کی طرف مخاطب ہو کر کیا تھا ''حضور کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ابوجعفرؑ سے کوئی مسئلہ دریافت کروں۔''

مامون نے کہا ''تم کو خود ان سے اجازت طلب کرنا چاہیئے۔''

یحییٰ امام کی طرف متوجہ ہوا اور کہا ''کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ دریافت کروں؟''

فرمایا ''تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو۔''

یحییٰ نے پوچھا کہ ''حالت احرام میں اگر کوئی شخص شکار کرتے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ حضرت امام محمد تقیؑ کی علمی بلندی سے بالکل واقف نہ تھا۔ وہ اپنے غرور علم اور جہالت سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ کم سن صاحبزادے تو ہیں ہی روزمرہ کے روزے نماز کے مسائل سے واقف ہوں تو ہوں مگر حج وغیرہ کے احکام اور حالت احرام میں جن چیزوں کی ممانعت ہے ان کے کفاروں سے بھلا کہاں واقف ہوں گے۔

امامؑ نے اس کے جواب میں اس طرح سوال کے گوشوں کی الگ الگ تحلیل فرمائی جس سے بغیر کوئی جواب

اصل مسئلے کا دیئے ہوئے آپ کے علم کی گہرائیوں کا یحییٰ اور تمام اہل محفل کو اندازہ ہوگیا۔ یحییٰ خود بھی اپنے کو سبک پانے لگا اور تمام مجمع بھی اس کا سبک ہونا محسوس کرنے لگا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مبہم اور مجمل ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شکار حل میں تھا یا حرم میں؟ شکار کرنے والا مسئلے سے واقف تھا یا ناواقف؟ اس نے عمداً اس جانور کو مارڈالا یا دھوکے سے قتل ہوگیا؟ وہ شخص آزاد تھا یا غلام؟ کمسن تھا یا بالغ؟ پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا یا اس کے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا؟ شکار پرندہ کا تھا یا کوئی اور؟ چھوٹا تھا یا بڑا؟ وہ اپنے فعل پر اصرار رکھتا ہے یا پشیمان ہے؟ رات کو یا پوشیدہ طریقہ پر اس نے شکار کیا یا دن دہاڑے اور علانیہ؟ احرام عمرہ کا تھا یا حج کا؟ جب تک یہ تمام تفصیلات نہ بتائے جائیں اس مسئلے کا کوئی ایک معین حکم نہیں بتایا جا سکتا۔

یحییٰ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا بہرحال فقہی مسائل پر کچھ نہ کچھ اس کی نظر بھی تھی وہ ان کثیر التعداد شقوں کے پیدا کرنے ہی سے خوب سمجھ گیا کہ ان کا مقابلہ میرے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی شکستگی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تمام دیکھنے والوں نے اندازہ کرلیا۔ اب اس کی زبان خاموش تھی اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ مامون نے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کرکے اس سے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور حضرت سے عرض کیا کہ پھر آپ ہی ان تمام شقوں کے احکام بیان فرما دیجیے تا کہ ہم سب کو استفادہ کا موقع مل سکے۔ امام نے تفصیل کے ساتھ تمام صورتوں کے جداگانہ جو احکام تھے بیان فرمائے۔ یحییٰ ہکا بکا امام کا منہ دیکھ رہا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ مامون کو بھی کد تھی کہ وہ اتمام حجت کو انتہائی درجے تک پہونچا دے۔ اس لیے اس نے امام سے عرض کیا کہ ''اگر مناسب معلوم ہو تو آپ بھی یحییٰ سے کوئی سوال فرمائیں۔'' حضرت نے اخلاقاً یحییٰ سے دریافت فرمایا کہ ''کیا میں بھی تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں'' یحییٰ اب اپنے متعلق کسی دھوکے میں مبتلا نہ تھا۔ اپنا اور امام کا درجہ اسے خوب معلوم ہو چکا تھا اس لیے طرز گفتگو اس کا اب دوسرا ہی تھا۔ اس نے کہا کہ ''حضور دریافت فرمائیں اگر مجھے معلوم ہوگا تو عرض کردوں گا ورنہ خود حضور ہی سے معلوم کر لوں گا'' حضرت نے سوال کیا جس کے جواب میں یحییٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی عاجزی کا اقرار کیا اور پھر امامؑ نے خود اس سوال کو حل فرما دیا۔ مامون کو اپنی بات کے بالا رہنے کی خوشی تھی۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ:۔

''دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ یہ وہ گھرانا ہے جو قدرت کی طرف سے علم کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کے بچوں کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' مجمع میں جوش و خروش تھا سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ بیشک جو آپ کی رائے ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور یقینا ابوجعفر محمد ابن علیؑ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ مامون نے اس کے بعد ذرا بھی تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور اسی جلسے میں امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ ام الفضل کا عقد کردیا۔ نکاح کے قبل جو خطبہ ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے وہی ہے جو کہ امام محمد تقیؑ نے اس عقد کے موقع پر اپنی زبان مبارک پر جاری کیا تھا۔ یہی بطور یادگار نکاح کے موقع پر باقی رکھا گیا ہے۔ مامون نے اس شادی کی خوشی میں بڑی

فیاضی سے کام لیا، لاکھوں روپیہ خیر وخیرات میں تقسیم کیا گیا اور تمام رعایا کو انعامات وعطایا کے ساتھ مالا مال کیا گیا۔

مدینہ کی طرف واپسی: شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک امام محمد تقیؑ بغداد میں مقیم رہے اس کے بعد مامون نے بہت اہتمام کے ساتھ ام الفضل کو حضرت کے ساتھ رخصت کر دیا اور امام مدینہ میں واپس تشریف لائے۔

اخلاق و اوصاف: امام محمد تقیؑ اخلاق و اوصاف میں انسانیت کی اس بلندی پر تھے جس کی تکمیل رسولؐ اور آل رسولؐ کا طرۂ امتیاز تھی۔ ہر ایک سے جھک کر ملنا، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا، مساوات اور سادگی کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا، غرباء کی پوشیدہ طور پر خبر لینا، دوستوں کے علاوہ دشمنوں تک سے اچھا سلوک کرتے رہنا، مہمانوں کی خاطر داری میں انہاک اور علمی اور مذہبی پیاسوں کے لیے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپ کی سیرت زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسے اس سلسلۂ عصمت کے دوسرے تمام افراد کا تھا۔

اہل دنیا جو آپ کی بلندی نفس کا پورا اندازہ نہ رکھتے تھے انہیں یہ تصور ضرور ہوتا تھا کہ ایک کمسن بچے کا عظیم الشان مسلمان سلطنت کے شہنشاہ کا داماد ہو جانا یقیناً اس کے چال ڈھال، طور طریقے بدل دے گا اور اس کی زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل جائے گی۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا مقصد ہو سکتا ہے جو مامون کی کوتاہ نگاہ کے سامنے بھی تھا۔ بنی امیہ یا بنی عباس کے بادشاہوں کو آل رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا جتنا ان کے صفات سے۔ وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتے تھے کہ بلندی اخلاق اور معراج انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلے میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے، یہ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ اسی کے لیے گھبرا گھبرا کر وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی اور پھر امام رضاؑ کو ولیعہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ۔ فقط ظاہری شکل وصورت میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا۔ مگر اصل حقیقت دونوں صورتوں کی ایک تھی۔ جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے اسی طرح امام رضاؑ ولیعہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے تو آپ کو زہر کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

اب مامون کے نقطۂ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین تقریباً آٹھ برس کا بچہ ہے جو تین برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا۔ حکومت وقت کی سیاسی سوجھ بوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقے پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومت وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک، قائم ہے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کے ولیعہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب نہیں تصور کرتا تھا۔ اس لیے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی۔ اس میں تبدیلی اگر نہیں ہوئی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ جو آٹھ برس کے سن

سے قصر حکومت میں نشو ونما پا کر بڑھیں وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوا ان لوگوں کے جوان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے اس وقت کا ہر شخص یقیناً مامون ہی کا ہم خیال ہوگا۔ مگر دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا کہ وہ آٹھ برس کا بچہ جسے شہنشاہ اسلام کا داماد بنا دیا گیا ہے اس عمر میں اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اصول کا اتنا پابند ہے کہ وہ شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار کر دیتا ہے اور اس وقت بھی کہ جب بغداد میں قیام رہتا ہے تو ایک علیحٰدہ مکان بکرایہ لے کر اس میں قیام فرماتے ہیں۔ اس سے بھی امام کی مستحکم قوت ارادی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عموماً مالی اعتبار سے لڑکی والے کچھ بھی بڑا درجہ رکھتے ہوتے ہیں تو وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں وہ رہیں وہیں داماد بھی رہے۔ اس گھر میں نہ سہی تو کم از کم اسی شہر میں قیام رہے۔ مگر امام محمد تقیؑ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مامون کو حجاز واپس جانے کی اجازت پر مجبور کر دیا۔ یقیناً یہ امر ایک چاہنے والے باپ اور مامون ایسے بااقتدار کے لیے انتہائی ناگوار تھا مگر اسے لڑکی کی جدائی گوارا کرنا پڑی اور امام مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ڈیوڑھی کا وہی انداز رہا جو اس کے پہلے تھا۔ نہ پہریدار نہ کوئی خاص روک ٹوک، نہ تزک واحتشام نہ اوقات ملاقات، نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤں میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبویؐ میں رہتی تھی جہاں مسلمان حضرت کے وعظ ونصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویان حدیث احادیث دریافت کرتے تھے، طلاب علم مسائل پوچھتے تھے، صاف ظاہر تھا کہ جعفر صادقؑ ہی کا جانشین ہے جو اسی مسند علم پر بیٹھا ہوا ہدایت کا کام انجام دے رہا ہے۔

امور خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں آپ کے بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا ان ہی حدود میں آپ نے ام الفضل کو بھی رکھا۔ آپ نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی کہ آپ کی بیوی ایک شہنشاہ وقت کی بیٹی ہیں۔ چنانچہ ام الفضل کے ہوتے ہوئے آپ نے حضرت عمار یاسر کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ عقد بھی فرمایا اور قدرت کو نسل امامت اسی خاتون سے باقی رکھنا منظور تھی۔ یہی امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ ام الفضل نے اس کی شکایت اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجی۔ مامون کے دل کے لیے بھی یہ کچھ کم تکلیف دہ امر نہ تھا مگر اسے اب اپنے کیے کو نباہنا تھا، اس نے ام الفضل کو جواب لکھا کہ تمہارا عقد ابو جعفرؑ کے ساتھ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان پر کسی حلال خدا کو حرام کر دوں۔ مجھ سے اب اس قسم کی شکایت نہ کرنا۔

یہ جواب دے کر حقیقت میں اس نے اپنی خفت مٹائی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اگر مذہبی حیثیت سے کوئی بااحترام خاتون ہوئی ہے تو اس کی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا گیا۔ جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جناب خدیجہ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کے لیے جناب فاطمہ زہراؑ۔ مگر شہنشاہ دنیا کی بیٹی کو یہ امتیاز دینا صرف اس لیے کہ وہ ایک بادشاہ کی بیٹی

ہے، اسلام کی اس روح کے خلاف تھا جس کے آل محمد محافظ تھے۔ اس لیے امام محمد تقیؑ نے اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔

تبلیغ و ہدایت: آپ کی تقریر بہت دلکش اور پر تاثیر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ زمانہ حج میں مکہ معظّمہ میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر آپ نے احکام شرع کی تبلیغ فرمائی تو بڑے بڑے علماء دم بخود اور دنگ رہ گئے اور انہیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے ایسی جامع تقریر کبھی نہیں سنی۔

امام رضاؑ کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو امام موسیٰ کاظمؑ پر توقف کرتا تھا یعنی آپ کے بعد امام رضا علیہ السلام کی امامت کا قائل نہیں تھا اور اس لیے واقفیہ کہلاتا تھا۔ امام محمد تقیؑ نے اپنے دور میں اس گروہ میں ایسی کامیاب تبلیغ فرمائی کہ سب اپنے عقیدے سے تائب ہو گئے اور آپ کے زمانہ ہی میں کوئی ایک شخص ایسا باقی نہ رہ گیا جو اس مسلک کا حامی ہو۔

بہت سے بزرگ مرتبہ علماء نے آپ سے علوم اہلبیتؑ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ایسے مختصر حکیمانہ مقولوں کا بھی ایک ذخیرہ ہے جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے بعد امام محمد تقیؑ کے مقولوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ الٰہیات اور توحید کے متعلق آپ کے بعض بلند پایہ خطبے بھی موجود ہیں۔

عراق کا آخری سفر: ۲۱۸ھ میں مامون نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اب مامون کا بھائی اور ام الفضل کا چچا مؤتمن جو امام رضاؑ کے بعد ولی عہد بنایا جا چکا تھا تخت سلطنت پر بیٹھا اور معتصم باللہ عباسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی امام محمد تقیؑ سے متعلق ام الفضل کے اسی طرح کے شکایتی خطوط کی رفتار بڑھ گئی جس طرح کے اس نے اپنے باپ مامون کو بھیجے تھے۔ مامون نے چونکہ تمام بنی عباس کی مخالفتوں کے بعد بھی اپنی لڑکی کا نکاح امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ کر دیا تھا اس لیے اپنی بات کی پچ اور کیے کی لاج رکھنے کی خاطر اس نے ان شکایتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی بلکہ مایوس کر دینے والے جواب سے بیٹی کی زبان بند کر دی تھی مگر معتصم کو جو امام رضاؑ کی ولی عہدی کا داغ اپنے سینہ پر اٹھائے ہوئے تھا اور امام محمد تقیؑ کو داماد بنائے جانے سے تمام بنی عباس کے نمایندے کی حیثیت سے پہلے ہی اختلاف کرنے والوں میں پیش پیش رہ چکا تھا۔ اب ام الفضل کے شکایتی خطوں کو اہمیت دے کر اپنے اس اختلاف کو جو اس نکاح سے تھا حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ پھر سب سے زیادہ امام محمد تقیؑ کی علمی مرجعیت، آپ کے اخلاقی اثر کا شہرہ جو حجاز سے بڑھ کر عراق تک پہونچا ہوا تھا، وہ بنائے مخاصمت جو معتصم کے بزرگوں کو امام محمد تقیؑ کے بزرگوں سے رہ چکی تھی، اور پھر اس سیاست کی ناکامی اور منصوبے کی شکست کا محسوس ہو جانا جو اس عقد کا محرک ہوا تھا جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے یہ تمام باتیں تھیں کہ معتصم مخالفت کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اپنی سلطنت کے دوسرے ہی سال امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بغداد کی طرف بلوا بھیجا، حاکم مدینہ عبدالملک کو اس بارے میں تاکیدی خط لکھا۔ مجبوراً امام محمد تقیؑ اپنے فرزند امام علی نقیؑ اور ان

بقیہ صفحہ ۳۵ پر

غلبۂ جذبات

حکیم الامت علامۂ ہندی مولانا سید احمد نقوی مجتہد طاب ثراہ

حیات انسانی کے دو مختلف اجزاء ہیں ایک حیات نباتی دوسرے حیات حیوانی ۔ انسانی زندگانی کے تمام افعال انہیں دو اصناف پر منقسم ہیں ۔ کھانا، پینا، سونا یہ اول الذکر کی مثالیں ہیں ۔ چلنا پھرنا اور ادراک سے کام لینا آخر الذکر کے مظاہر ہیں ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ علیٰ ترتیب زمانی کے لحاظ سے اول الذکر کو آخر الذکر پر تقدم ہے ۔ دیکھو بدل متحلل کی ضرورت، گرمی، سردی کا احساس ، خواب کی احتیاج، یہ چیزیں انسان میں ولادت کے ساتھ ہی پیدا ہوجاتی ہیں ۔ خلاف اس کے چلنے پھرنے کی قوت اور قوائے مدرکہ سے کام لینے کی قابلیت ایک مدت میں آتی ہے ۔ یہ کیفیت صرف جسمانی زندگی کی نہیں بلکہ ذہنی زندگی کی بھی ہوتی ہے ۔ چنانچہ شعور کے ابتدائی مدارج میں بھی وہی خصائص نقش ظہور پذیر ہوتے ہیں جس کا تعلق احساس سے ہوتا ہے اور اگر خصائص عقلی ظاہر نہیں ہوئے ہیں تو انہیں احساس خصائص کے تابع و مغلوب رہتے ہیں ۔ اسی لیئے تم دیکھتے ہو کہ بچوں، عورتوں، وحشیوں کے جذبات کس قدر قوی ہوتے ہیں اور ان کی عقل ان کے جذبات کے سامنے مغلوب و بے بس رہتی ہے ۔ مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کاروبار، ارسطو، فیثاغورث، کے وضع کردہ اصول منطق پر نہیں بلکہ طبعی اور خودرو جذبات کی رو پر چل رہا ہے کائنات کی مشینری جس کمانی سے چل رہی ہے وہ جذبات ہی کی قوت ہے ۔ جدھر جذبات کی رفتار ہوتی ہے اسی طرف انسان سے افعال اور اعمال سرزد ہوتے ہیں اور جذبات کی نوعیت پر انسان کی سیرت اور کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے ۔ البتہ عقل کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جذبات کے غیر محدود زور وقوت کو ایک حد تک محدود رکھے ۔

لہٰذا سیرت انسانی کی کنجی جذبات ہی کے ہاتھ میں ہے اور عقل افسرانہ حیثیت سے ان کی نگراں ہے ۔ اور چونکہ عقل ارتقائی حیثیت سے جذبات کے مقابلے میں بہت ہی کم عمر ہے اور خصائص ذہنی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے اس لیئے جہاں شعور اپنے انتہائی نقطۂ کمال سے پست ہوا اور شعور خفی کا دور دورا شروع ہوا وہیں عقل کی باگ فوراً ڈھیلی ہوجاتی ہے اور جذبات تقریباً مطلق العنان ہوجاتے ہیں اور انسان کی حیات نفسی کے ہر شعبے آزاد ہو جاتے ہیں ۔ ایسے حالت میں کسی کے سامنے اگر چہ وہ جماعت ہی کیوں نہ ہو اس کی عقل کو مخاطب کرنا قطعاً بیکار ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا مخالف اثر پڑتا ہے ۔ اس لیئے علمبرداران اصلاح کو لازم ہے کہ جن عقائد و خیالات کی بنیاد تمامتر جذبات پر ہیں ان کی رد میں دلائل و براہین سے کام نہ لیں اس لیئے کہ جو شی عقل کی راہ سے نہیں آتی ہے وہ عقل کے راستے سے نکل ہی نہیں سکتی ۔ جماعت کے خیالات و معتقدات جذبات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور

جذبات ہی انہیں ہٹا سکتے ہیں اور اسی طرح سے تعلیم میں ان جذبات کے مٹانے میں بے بس ہے اور اس کا کام قوت فکری کو جلا دینا ہے۔ تعقل قوی ہوجاتا ہے، استنباط مسائل کا بسہولت ہوتا ہے مختصر یہ ہے کہ عقل اور قوی حصہ کے نقش کے کسی اور شعبہ پر تعلیم وتربیت کا کچھ اثر نہیں ہوتا ہے۔ نخاعی قطعات اس کی دسترس سے باہر ہی رہتے ہیں۔ اگر انسانیت کے بالائی اور سطحی پہلو تعلیم سے چمک اٹھتے ہیں لیکن اندرونی اور دقیق خصائص جو اس کی اصل ہستی کا مایۂ خمیر ہوتے ہیں بدستور جوں کے توں رہتے ہیں۔ ارسطو اور افریقہ کے وحشیوں میں یوں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن جہاں تک جذبات طبعی واحساسات جبلی کا تعلق ہے دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

ماحصل تقریر کا یہ ہے کہ عقل اور تعلیم جذبات کی نامحدودی کو صرف روک سکتی ہے، انکو فنا نہیں کر سکتے۔ وہ اعمال اور افعال جن پر حیات انسانی کا اطلاق ہے وہ تین عنوانات کے تحت میں رکھے جا سکتے ہیں۔

۱۔وہ افعال جو افراد کی صیانت حیات کے لیئے لازمی ہیں جیسے کھانا، پینا، سونا۔

۲۔دوسرا وہ افعال جن سے نوع یا نسل کی بقا مقصود ہوتی ہے مثلاً تاہل، فرائض زوجیت، اولاد کی پرورش وغیرہ

۳۔وہ افعال جن سے ہیئت اجتماعیہ کا قیام اور ترقی وابستہ ہے مثلاً اگر ہم حیاتیات (بایالوجی) کے قوانین سے مدد لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ حیات انسانی میں یہ ہر سہ عناصر بلحاظ مدارج اہمیت ایک خاص ترتیب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور انہیں فرائض حیات کے مطابق اور متوازی جذبات ہی نفس انسانی میں ودیعت کیئے گئے ہیں تا کہ ان کے تقاضے سے بے چین ہوکر وہ ان فرائض کو بجالائے۔

انسان میں سب سے زیادہ قوی و غالب وہ جذبات ہیں جن سے ان کی حیات شخصی وابستہ ہے یعنی خود غرضانہ جذبات وخواہشات کا نمبر آتا ہے جن پر ان کی اولاد کا وجود اور زندگی منحصر ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر وہ احساسات ہوتے ہیں جن پر حیات عمرانی مشروط ہے اور یہ ترتیب عین فلسفۂ ارتقا کے مطابق ہے۔

خیال کرو ابتدائی تکویل حیات انسانی میں اگر افراد اپنے وجود کو دنیا کی ہر شی پر مقدم نہ سمجھے اور اگر اپنی زندگی کو ہر چیز پر ترجیح نہ دے تو نتیجہ کیا ہوتا۔ یہ ہوتا کہ تنازع للبقاء میں وہ اپنی پوری حفاظت سے غافل ہوکر فنا ہوجاتے اور اس طرح نہ نسل چل سکتی اور ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوسکتی۔

پس چونکہ فطرت کو نسل انسانی قائم رکھنا مدنظر تھا اس لیئے لامحالہ انسان میں جن جذبات کا سب سے پہلے نشو ونما ہوا وہ وہی تھے جن پر اس کے حیات شخصی کا انحصار تھا اور اس کے بعد وہ جن پر ان کی حیات نسلی کا دارومدار تھا۔ اسی طرح چونکہ ہیئت اجتماعیہ ترقی یافتہ صورت میں اس وقت قائم ہوئی جبکہ افراد کا شعور ایک خاص بلند سطح دماغی تک پہنچ چکا تھا اس لیئے جن جذبات پر حیات عمرانی مشروط ہے اس نے سب سے آخر میں نمو پایا۔ پس چونکہ ان مختلف النوع جذبات کے طبقات بہ لحاظ تاریخ تکوین باہم مختلف ہیں اس واسطے اس اختلاف جذبات سے عدل تاریخی کی مطابقت میں ان کی قوت کے مدارج میں مختلف ہیں یعنی جو جذبات

قدیم تر ہیں وہ نظام عصبی میں عمیق ترین طور پر منقش ہو گئے جو جذبات سب سے آخر میں پیدا ہوئے ہیں ان کی قوت ضعیف ترین ہے۔ چنانچہ آج تک جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ بداہتا ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کو سب سے زیادہ اپنی جان عزیز ہوتی ہے، اس کے بعد اولاد پر احباب و شناسا، اور جب ان طبقات میں باہم تصادم ہوتا ہے تو انسان عموماً اسی جذبہ کی پاسداری کرتا ہے جس کے نقوش اس کی فطرت میں سب سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ اولاد کی پرورش و پرداخت کے مصارف کے لیئے احباب کے مال کو ناجائز ذرائع سے اپنے تصرف میں لانا اور قحط کے زمانے میں شدت گرسنگی سے اپنی اولاد کو خود کھا جانا اسی کلیہ کے شواہد ہیں۔

یہ قوانین فطرت خواہ طبعیات و ریاضیات کے متعلق ہوں اور خواہ نفسیات کے اٹل ہونے میں جن کے مقابلے میں بڑی سے بڑی انسانی ہستی ایک ذرے کے برابر بھی قوت نہیں رکھتی مثالاً دو ایک نظائر پیش کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ قوانین فطرت بڑی سے بڑی ہستی سے اس طرح کھیلتے ہیں جیسے ایک وحشی اور بربری جاہل سے۔

سقراط یونانی فلسفہ کے نظام شمسی کا آفتاب علم وفضل و زہد و اتقا میں مشہور آفاق ہے۔ مورخین متفق اللفظ ہیں کہ ان کا قدم کبھی شاہ رہ اخلاق حسنہ سے باہر نہیں بڑھا ہے لیکن جب ''ایسپیا'' زن بازاری کے گرد اس کے حلقہ بگوشوں کا مجمع نظر آتا ہے تو اسی حلقہ میں سقراط بھی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ''ڈیوٹیما'' زن فاحشہ کی خلوت سرا میں جلوہ گر پائے جاتے ہیں اور کبھی ''الکیابڈس'' خوشرو مرد ساقی کے ہاتھ بیتابانہ جام مئے لے کر دکھائی دیتے ہیں۔

انجیلی مسیح ایک وقت بائیں رخسار پر طمانچہ کھا کر داہنے گال کو بھی سیلی کے لیئے پیش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور دوسرے وقت فرماتے ہیں کہ دو میں صلح کرانے نہیں تلوار چلانے آیا ہوں۔ ایک وقت چوری کی مذمت فرماتے ہیں اور دوسرے وقت کھیتوں کی بالیاں خود ہی شاگردوں کے ساتھ کھاتے نظر آتے ہیں۔ ایک وقت شراب کی ممانعت ہوتی ہے تو دوسرے وقت پانی کے خم پر شراب سازی کا معجزہ دیکھا جاتا ہے۔ اپنی ماں مریم کی یہ کہہ کر تحقیر کی جاتی ہے ''میں کیا جانوں وہ کون ہے''

شری کرشن مہاراج زاہدانہ اولوالعزمی کی زندگی کو دیکھو اور ساتھ ہی نوجوان دوشیزہ لڑکیوں سے عشق و عاشقی کے افسانے تاریخوں میں پڑھو۔ ''گوکل'' کی بود و باش کے زمانہ میں گوالوں کے بچوں کے ساتھ یارباشی اور ''گوپیوں'' کی ہم نشینی و ہم مشربی، اپنے مربی و محسن ''جودھا'' اور نند جی کو ''کنس'' کے قتل کے بعد حکومت ملتے ہی نہایت بے اعتنائی سے مایوس پلٹانا اور تعلّی و ترفع سے اپنی فرمانبرداری اور بادشاہی جتا کر دیرینہ تعلقات کا خاتمہ کر دینا۔

غرضیکہ ایسے ایسے تلون مزاجی کے کرشموں سے بڑی بڑی ہستیاں خالی نظر نہیں آتیں۔ آج نئی فطرت کے تمام ساز و سامان لیئے بڑی سے بڑی قابل تعظیم ہستی اپنے جذبات کے آگے اسی طرح سے محصور و ناچار نظر آتی ہے جیسے ایک بربری آفریقہ کا وحشی ــــــ!!

جرمنی ساری دنیا کو تہذیب و تمدن کا درس دینے کا مدعی تھا لیکن یہی جرمنی کا قیصر قہر و غضب کا عفریت بن کر

اٹھتا ہے اور 'تورین' کے قدیم کتبخانہ اور واجب الاحترام دارالعلوم کو چشم زدن میں خاکستر بنا دیتا ہے۔ ''ہیگل'' ہمیشہ دنیائے جرمنی کا ''ڈارون'' مانا گیا ہے لیکن جرمن وار میں وہ شمشیر بکف اپنی قوم کو خون میں نہاتے دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ ''پروفیسر ونٹ'' و ''منسٹر برگ'' نے ساری عمر نفسیات کے مباحث میں صرف کر دی لیکن ۱۸۶۴ء میں اپنی تمام قوت لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت میں صرف کر دی۔ ''اناٹول'' فرانس کا انشاء پردازوں کا امام تھا لیکن دوران جنگ میں اس کی انگلیاں بجائے کاغذ و قلم توپ و تفنگ سے کھیلتی رہتی تھیں۔ ہزاروں نظارے اس بات کے ہیں کہ انسان کیسی ہی بزرگ و قابل و عالم ہستی ہو فطرت کے اس قانون کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

اسی اصول فطرت کو دیکھتے ہوئے خلاق عالم کو ایسے نفوس کی ضرورت ناگزیر ہوئی جو مافوق البشر اور قوانین فطرت سے بالکل بے تعلق ہوں۔ اس کی نبوت و رسالت اور اس کی فرع جلیل امارت کو خلاف فطرت انسانی خلق کیا گیا اور ایک گھرانے سے مخصوص کر دیا۔ تاکہ ایک ہی مزاج عقلی کے تحت میں سب نبوتیں ہوں اور مختلف جذبات کے تحت میں رہ کر نبوتوں میں اختلاف نہ ہو جائے۔

اور چونکہ نبوت و رسالت اصلاح عامہ اور جذبہ محبت واشیاء وہیئت اجتماعی کے قیام کی غرض سے قائم کی گئی ہے اس لیئے گروہ انبیاء و مرسلین میں بطور توارث کے ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور نظام عصبی میں ان کی اسی طرح سے عمیق نقوش قائم ہو جاتے ہیں جس طرح سے عام شریعت میں نفس پرستی و خودغرضی اور نسلی اغراض مرتشم ہوتے ہیں اور اسی کا نام عصمت ہے کہ تمام جذبات معدوم ہو کر صرف وہی افعال سرزد ہوں جن سے ہیئت اجتماعی کی حفاظت و بقا ہو۔

چنانچہ ہم اس گروہ مقدس میں سب کی نبوتی زندگی کا جائزہ سردست نہیں لے سکتے۔ ہم اسوقت صرف ایک اس نفس مطمئنہ کو پیش کرتے ہیں جو عالم میں عام بشریت کو چیلنج دیتا ہے اور مافوق البشریت خصائل میں اپنی آپ نظیر ہے۔ جو قدسیوں کا سردار اور کروبیوں کا سرتاج، سرخیل شہدا اور نبوت و رسالت کی کڑی اور ختم نبوت کا سر اعظم ہے یعنی حسین علیہ السلام روحی لہ الفداء

ان کی ولادت سے لے کر شہادت تک ان کے مضبوط کیرکٹر میں کوئی تلون مزاجی و متضاد بات نہ ملتی ہے نہ ملے گی۔ تفصیل کا قیام نہیں ہے اجمالاً سنو۔

حسین علیہ السلام آغوش مادر میں اپنی شہادت و واقعات و حوادث کربلا سن کر مرنے کے لیئے اس وقت سے تیاری کر رہے ہیں۔ ان کے پالنے والے ان کی افتادِ مزاج سے اسی وقت سے باخبر تھے کہ یہ ہمت اور شجاعت کا دیوتا صبر و استقلال و مظلومیت کا پیکر کسی جبر و تشدد کے سامنے اپنے اصول کی حمایت سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے گا۔ یہ وجود محترم حیات شخصی و حیات نسلی کے غلبہ جذبات سے مغلوب نہ ہو کر حیات جامعہ انسانی پر مر مٹنے کا اس کی فطرت کا نقش اول جذبہ بقاء ہیئت اجتماعی ہے۔ اس لیئے تھپک تھپک کر سلانے میں لوریاں صبر و استقلال، شجاعت و مردانگی کی دی جاتی تھیں۔ بچپنے کے رونے اور ضد پر واقعات کربلا یاد دلا کر چپ کیا جاتا تھا۔ بھوک اور پیاس کے وقت یتیم و فقیر کو سامنے کی جو کی روٹی اٹھا کر دی جاتی ہے اور تین تین روز کی بھوک

پیاس کا بچپنے سے عادی بنایا جا رہا ہے اور دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم کرنے کے لیئے ایثار کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔

حسین ان افعال و اعمال سے بے اعتنا ہیں جن پر صیانت نفس موقوف ہے بمقابل دوسروں کی صیانت نفس کے۔ اور خود غرضی و نفس پروری کی کوئی جھلک ان کے افعال میں نہ تھی۔ وہ نفسی و نسلی خواہشات و جذبات کو ہمیشہ نوعی اور قومی مفاد پر نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔

اس پیکر عمل نے بتا دیا کہ اصلاح نوعی کے لیئے جان و مال، اولاد و عزیز و اقارب قربان کر دینے والی چیزیں ہیں اور یہی ان کا صحیح مصرف ہے۔

ہر وقت اور ہر حال میں غیر متبدل رویہ سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ حیات انسانی کے ہر دو عنوانات یعنی صیانت حیات اور بقاء نسل، یہ دونوں ہیئت اجتماعیہ کی بقا و اصلاح و حفاظت کی غرض سے انسان پر عائد کی گئی ہیں۔ وہ مسیح انجیلی کی طرح صلیب پر ''ایلی ایلی ماستقبانی'' چلا چلا کر مشکل سے جان دینے کو اپنے لیئے عار سمجھتے اور عزیز و اقارب بلکہ ششماہیہ بچہ کو بھی اس ہیبتناک قربان گاہ پر چڑھا کر خوشی و مسرت کی جان دیتے ہیں۔

شری کرشن مہاراج ''پرواسیش'' کے بڑے جاتر میں عیش و نشاط کی داد دیتے ہوئے شراب خواری کی ترنگ میں اپنے قریبی رشتہ داروں اور اپنے دوست ''کوروں'' اور اپنے بے شمار لڑکوں اور پوتوں کو بلوائیوں کی طرح قتل عام کر کے بے گور و کفن نعشوں پر بغیر ایک نگاہ غلط انداز ڈالے ہوئے بھی راہی ہوتے ہیں اور خود بھی سوتے ہیں ایک درخت کے نیچے شکاری کے تیر سے زخمی ہو کر دنیا کو الوداع کرتے ہیں ـــــــ!!

مگر حسین علیہ السلام یزید اور اس کے ساتھیوں کی شر خواری و ظلم و استبداد پر احتجاج کرتے ہوئے اور اسکی خود غرضانہ حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیئے اپنے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ کربلا کے چٹیل میدان میں آغشتہ بخاک و خون ہو کر بے گور و کفن تین روز تک پڑے رہے۔

''گوتم بدھ'' اور ''سقراط'' اپنی موت کے وقت وعظ و نصیحت کرتے کرتے جان دیتے ہیں تو حسین روز عاشور اپنے متبعین کو اپنے عمل سے ہر مصیبت کا ابدی علاج بتاتے ہیں۔ بھوک و پیاس کی شدت کا اظہار کرنے پر اصول کی مخالفت اور بیعت یزید کے شیطانی مطالبہ کو لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ ہر ذلت و رسوائی اور بدترین مصائب میں مبتلا ہو کر جان دینے کو اصول کی حفاظت میں ترجیح دیتے ہوئے ''العار اولیٰ من دخول النار'' کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ عار و ننگ کے لیئے جان دیدینا اور رضاء الٰہی کے لیئے موت اور ہر ننگ و عار کو گوارا کر لینا ہی وہ آخری نصیحت ہے جو حسینی زندگی کا ماحصل ہے۔ اور تمام جذبات فاسدہ کا یہی تریاق۔ ہر خوبی کا سرچشمہ اور آخری قطرہ خون کی قوم کو دعوت ہے۔

لہٰذا حسین مظلوم کی صحیح عزاداری و سوگواری اور رونے رلانے میں اگر یہ جذبہ کارفرما نہیں ہے تو بے سود و بے ثمر ہے۔ سچا حسینی وہ ہے کہ خودداری میں مر مٹنے اور خدائے تعالیٰ کی مرضی کی حفاظت میں جان و عزت کچھ بھی عزیز نہ کرے۔

❁❁❁

شجاعت کا فلسفہ

عماد العلماء علامہ سید محمد رضی طاب ثراہ

انسان کی ان اعلیٰ صفات میں سے جن کی وجہ سے اسے کائنات پر فوقیت حاصل ہے، بلندترین صفت شجاعت ہے۔

شجاعت کے لفظی معنی بہادری کے ہیں لیکن اسلام کے نزدیک بہادری یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت و طاقت کو کمزوروں پر استعمال کیا جائے یا اسے کسی غلط یا نامناسب جگہ پر صرف کیا جائے۔ بہت سے نافہم لوگ اسی بات کو بہادری اور شجاعت سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ اپنی قوت کا مظاہرہ ہو۔ بات بات پہ جھگڑے اور فسادات کئے جائیں، کمزوروں اور ضعیفوں پر قوت آزمائی ہو اور زبردستی دوسروں سے اپنی بات منوائی جائے۔

حقیقت میں اس کا شجاعت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ شجاعت یہ ہے کہ انسان مصیبتوں میں گھر کر اور بڑے سے بڑے خطرے کے سامنے جا کر بھی اپنے دل اور اپنی عقل پر پورا قابو رکھے اور غصہ یا خوف میں کوئی ایسی بات نہ کرے اور کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھے جو دین کے خلاف اور عقل وفہم کے منافی ہو۔ شجاعت درندگی کا نام نہیں ہے جس طرح ایک پھاڑ کھانے والا جانور عقل نہیں رکھتا اور جس کو پا جاتا ہے اس پر حملہ کر بیٹھتا ہے، جس کو دیکھ لیتا ہے اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا سوائے اسکے کہ وہ اپنی خواہش کو پورا کرے اور اپنی طاقت کو استعمال کرے چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ شجاعت نہیں ہے اس کا نام بہادری نہیں ہے، یہ تو حیوانیت ہے۔ ایسا انسان جو اپنی عقل اور سمجھ سے کام نہ لے اور اپنی قوت و طاقت کو ان باتوں میں صرف کرے جن میں ان کو استعمال نہ کرنا چاہیے، ان جانوروں سے بھی بدتر ہے جن کا کام ہی پھاڑ کھانا ہے کیونکہ وہ عقل وفہم نہیں رکھتے اور انسان کے پاس یہ امتیاز اور یہ صفت موجود ہے۔ پھر بھی وہ عقل سے کام نہ لے تو یقیناً وہ جانوروں سے بھی پست تر ہے۔ انسان کو اللہ نے برتری عطا فرمائی ہے، اس کا مقام اور اس کی عزت بلند ہے اور اسے ساری کائنات پر فضیلت ملی ہے تو کیا اس لیے کہ وہ جانوروں سے بدتر ہو جائے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں اس سے سرزد ہونے لگیں جو کسی نافہم اور بے شعور جانور ہی سے ممکن ہو سکتی ہیں۔ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ انسان کی فضیلت اور شرف یہی ہے کہ وہ کسی وقت بھی عقل وہوش اور فہم وشعور کا دامن نہ چھوڑے اور بڑی سے بڑی آفت و مصیبت کے مقابلہ میں بھی جو کچھ کرے وہ سوچ سمجھ کر، دل پر قابو رکھے۔ ، دماغی توازن نہ کھوئے ، استقلال اور ہوشمندی سے کام لے۔ تحمل وصبر کو فراموش نہ ہونے دے، نتائج وعواقب نگاہ میں رہیں۔ احکام خدا اور دین و مذہب کی قدریں پیش نظر ہوں، موقع اور محل کو جانتا ہو۔ اپنے فرائض سے آگاہ ہو، دوسروں کے حقوق پر نگاہ رکھتا ہو۔ دل میں خدا کا خوف ہو

اور اس کی عظیم سلطنت اور اقتدار پر یقین ہو، غیبی امداد پر بھروسہ ہو۔ ایسا انسان جس میں یہ صفتیں موجود ہوں وہ شجاع اور بہادر ہوگا۔ بڑی سے بڑی مادی طاقت اس کے دل میں رعب اور خوف نہیں پیدا کرسکتی اور نہ کسی کی کمزوری اور ضعف اسے ظلم وجور اور ایذ رسانی کی طرف دعوت دے سکتا ہے۔ وہ وہی کرے گا جو اس کا احساس فرض اسے بتائے گا اور وہی کہے گا جو عقل وفہم کے نزدیک صحیح اور جائز ہوگا۔

یونیورسٹیوں اور دانشکدوں کی زندگی سے لے کر عوامی گذرگاہوں اور پست ترین اجتماعی و انفرادی حیات کے مرکزوں تک شجاعت کا معیار ایک ہی ہے۔ علمی بحثیں ہوں، مذہبی مناظرے ہوں یا نجی اور ذاتی معاملات ہوں۔ کچھ بھی ہو شجاعت نام ہے عمل اور برداشت کی طاقت کے صحیح استعمال کا، جسمانی قوت کے جائز مصرف کا اور مصائب و آلام اور بڑے سے بڑے خوف اور خطر کے وقت پامردی اور استقلال وجرأت کے اعلیٰ ترین مظاہرہ کا جو عقل واحتیاط کے مطابق ہو۔ حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے'' **اشجع الناس من غلب هواه** ''سب سے زیادہ بہادر انسان وہ ہے جو اپنی خواہش نفس پر غالب آجائے۔ مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات پر آنکھ بند کرکے عمل نہ کرے بلکہ وہی کرے جس کی عقل اجازت دے اور جو خدا کے نزدیک درست وروا ہو۔

شجاعت کی صفت بغیر نفس پر قابو پیدا کئے نہیں حاصل ہوسکتی جس نے اپنے نفس کو قبضہ میں کرلیا وہ بڑا بہادر ہے اور جو خود ہی اپنے نفس کے قابو میں ہوگیا اور اس کا تابع بن گیا اس سے بڑھ کر بودا کوئی دوسرا انسان نہیں ہوسکتا۔ اس لیے شجاعت اس کا نام ہے کہ انسان جس طرح اپنی نجی اور عائلی زندگی کے تمام شعبوں میں کسی وقت بھی اپنے توازن عقلی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اسی طرح اجتماعی حیات کے ہر گوشہ میں اس صفت کو مضبوطی کے ساتھ باقی رکھے۔ عقیدہ اور مذہب کے اظہار کا موقع ہو، سیاسی مقابلے ہوں، جسمانی طاقت کے امتحان ہوں، ملکی انتظامات کے مسائل ہوں، قومی اور ملی امور ہوں، آفات ارضی وسماوی کا مقابلہ ہو یا دشمن کی خوفناک فوجوں کا مقابلہ ہو، ہر میدان حیات اور ہر شعبۂ زندگی میں شجاعت کا یکساں معیار ہے اور وہ یہی کہ صبر وضبط اور عقل و ہوش کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور ہمیشہ نفس پر قابو رہے۔ اس دنیا میں کون سا ایسا انسان ہے جس کی زندگی میں اسے مصائب وآلام کا مقابلہ نہ کرنا پڑا ہو۔ یہی مصیبتیں اور آفتیں انسان کی طاقت صبر اور صفت شجاعت کا مظہر ہوتی ہیں اور ان ہی سے انسان کو آزمایا جاتا ہے۔ بہادر وہ انسان ہے جو اس آزمائش میں پورا اترتا ہے اور بودا وہ ہے جو اس امتحان میں ناکام ہوجاتا ہے اور زندگی کی ان بلندیوں تک پہنچنے سے محروم ہوجاتا ہے جہاں ایک شجاع اور بہادر کا مقام ہے۔ نفس کی خواہش تو وقتی طور پر پوری ہی ہوجاتی ہے، دل کی بھڑاس نکل ہی جاتی ہے، انتقام کی آگ بجھ جاتی ہے، ظلم کی پیاس میں سکون حاصل ہوجاتا ہے، حصول اقتدار کی لگن پوری ہوجاتی ہے۔ جو چاہتا ہے دل وہ سب مل جاتا ہے اور مل سکتا ہے۔ اور نفس امارہ کی ہر ضد پوری ہوجاتی ہے لیکن نہیں ملتی تو انسانیت کی بلندی اور نہیں حاصل ہوتا تو وہ شرف وعزت اور مقام جو اللہ نے بہادروں اور شجاعوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

اللہ کے احکام پر عمل کرنا بہادری ہے۔ مرض ہو، خوف ہو، مصیبتوں کے طوفانی اژدہوں کا سامنا ہو، میدان جنگ ہو یا پھولوں کا بستر ہو، دوستوں کی محفل ہو یا دشمنوں کا نرغہ ہو، خدا کو نہ بھولنا اور اس کے احکام پر سر تسلیم خم کیے رہنا شجاعت ہے۔ نیند کا طوفان گھیرے ہوئے ہے، نرم بستروں پر کروٹیں لینے کو دل چاہ رہا ہے مگر آواز اذان کے ساتھ آرام و راحت کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کے لیے اٹھنا اور اس کی بارگاہ میں سر بسجود ہو جانا یہ بھی شجاعت ہے۔ اسی طرح جس طرح میدان کارزار میں خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنا اور برستی ہوئی آگ میں بے جگری کے ساتھ ٹھہرنا شجاعت ہے۔ مصائب کے طوفانوں کا جو بہادر ہیں وہ ہنس ہنس کے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پہاڑ کی طرح جمے ہوئے قدم کسی مصیبت کی ٹکرے سے جنبش نہیں کھاتے۔ شجاعت وہ صفت ہے جسے دشمن بھی عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور بوداپن وہ مذموم صفت ہے جسے خود دوست بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے شجاعت کی صفت بغیر نفس پر قابو پائے نہیں ملتی، بغیر عقل و ہوش سنبھالے حاصل نہیں ہوتی۔ اور بغیر تحمل وصبر کے نہیں پائی جاتی۔ اس لیے جو صابر نہیں وہ بہادر نہیں، جو نفس پر غالب نہیں وہ شجاع نہیں، جو عقل کی بات نہ کرے وہ شجاع نہیں، جو ادائے فرض میں خواہش نفس کو مقدم کر دے اس میں شجاعت نہیں، جس کے پاس تحمل وصبر کی دولت نہ ہو وہ بہادر نہیں ہو سکتا۔

جس طرح اللہ کے احکام پر عمل کرنا اور ہر خواہش نفس کے مقابلے میں اس کو ترجیح دینا شجاعت ہے اسی طرح حقوق عباد کو پورا کرنا اور اس میں خواہش نفس کی مخالفت کرنا بھی شجاعت و بہادری ہے۔ قوی تر انسان کا ایک کمزور فرد کے حق کو مان لینا بہادری ہے اور اس کے حقوق کو پامال کرنا بزدلی ہے۔ ایذ ارسانی کا انتقام لینا جائز سہی لیکن معاف کر دینا اور درگذر کرنا بہادر ہے۔

فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ جس نے جرم کو معاف کر دیا اور اسکی اصلاح کی اس کی جزا اسے اللہ عطا فرمائے گا۔

یہی شجاعت و بہادری وہ اعلیٰ ترین صفت تھی جس نے مٹھی بھر مسلمانوں کو کرۂ زمین کے ہر حصہ پر پھیلا دیا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی پہلی لڑائی ''بدر'' میں ہوئی۔ ان کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی جن کے مقابلہ میں دشمن کی بڑی بھاری فوج تھی جو ہر طرح کے سامان جنگ سے مسلح تھی مگر مسلمانوں کی اس بے سرو سامان فوج کے پاس جو سب سے بڑا ہتھیار تھا وہ رسولؐ کی تربیت کا شرف تھا اور اسلامی تعلیم کا اسلحہ تھا۔ جس کی مدد سے ان کو فتح حاصل ہوئی اور صرف مکہ کے چند سردار ہی نہیں، اس بہادری کی صفت نے تو ان کے قدموں پر کسریٰ اور خاقان وقیصر کے تاج بھی پھینک دیئے تھے اور مشرق و مغرب میں ان کے اقتدار کے پھریرے اڑنے لگے تھے۔

شجاعت بغیر صبر و تحمل کے نہیں مل سکتی۔ اسلام نے صبر کرنے کی اس طرح تعلیم دی ہے۔ **واصبر علیٰ ما اصابک ان ذلک من عزم الامور** جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو اور بے شک صبر کرنا تو بڑی ہمت کا کام ہے۔ نفسانی خواہشات پر عمل نہ کرنا بہادری ہے اور ان کو حکم خدا اور فیصلۂ عقل پر مقدم کر دینا بزدلی ہے۔ جنگ خندق میں

شیر خدا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی تلوار مشہور سردار عمرو بن عبدود کے سر پر لگ چکی ہے اور وہ زمین پر تڑپ رہا ہے آپ اس دشمن خدا کے سینے پر پہنچے اور سر کاٹنا چاہا۔ اسی حالت میں عمرو نے آپ کے چہرۂ مبارک کی طرف تھوک کر بے ادبی کی حضرت امیر المومنین علیؑ فوراً اس کے سینہ پر سے اتر آئے اور جب غصہ کم ہوا تو پھر آگے بڑھے اور اس کا سر جدا فرمایا۔ جب جنگ ختم ہو چکی تو کسی نے سوال کیا کہ آپ نے دشمن کو قابو میں لاکے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب اس نے میری طرف تھوکا تھا تو مجھے غصہ آ گیا تھا اس کی اس حرکت پر اس لیے میں اس کے سینہ پر سے اتر آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو میری اس خدمت دینی میں میرا ذاتی جذبۂ انتقام شریک ہو جائے اور جب وہ غصہ فرو ہو گیا تو میں نے اس کا سر جدا کر دیا۔ اسلام کی ہمارے لیے یہ تعلیم ہے کہ ہم کسی وقت بھی اپنے فرض کے احساس میں نفسانی جذبات کی آمیزش نہ ہونے دیں اور جو کچھ بھی کریں وہ وہی جس کی خدا نے اجازت دی ہو۔

اسلامی تاریخ شجاعت و بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے بہادر اسلاف کے نام انسانی حافظہ سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس سب سے بڑا اسلحہ ہماری تاریخ ہے اور ہمارے بزرگوں کے کارنامے ہیں جو ہماری رگ حیات میں شجاعت کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے اور ان میں کبھی نہ مٹنے والی روح بہادری پھونکتے رہیں گے اور یہ وہ تاریخ کی قدریں ہیں جو ہمارے بچہ بچہ کے ذہن میں ثبت ہیں۔

بقیہ امام محمد تقی علیہ السلام

کی والدہ کو مدینہ میں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔

وفات: بغداد میں تشریف لانے کے بعد تقریباً ایک سال تک معتصم نے بظاہر آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی مگر آپ کا یہاں قیام خود ہی ایک جبری حیثیت رکھتا تھا جسے نظر بندی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اسی خاموش حربے سے جو اکثر اس خاندان کے بزرگوں کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ۲۹ رذی القعدہ ۲۲۰ھ میں زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور اپنے جد بزرگوار حضرت امام موسی کاظمؑ کے پاس دفن ہوئے۔ آپ ہی کی شرکت کا لحاظ کرکے عربی قاعدے سے اس شہر کا نام کاظمین (دو کاظم یعنی غصّہ کو ضبط کرنے والے) مشہور ہوا ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے لقب کو صراحۃً سامنے رکھا گیا جبکہ موجودہ زمانے میں اسٹیشن کا نام جوادین (دو جواد المعنی فیاض) درج ہے جس میں صراحۃً حضرت امام محمد تقیؑ کے لقب کو ظاہر کیا جا رہا ہے چونکہ آپ کا لقب تقی بھی تھا اور جواد بھی۔

رضوی سید: یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنے سادات رضوی کہلاتے ہیں وہ دراصل تقوی ہیں یعنی حضرت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں۔ اگر حضرت امام رضاؑ کی اولاد امام محمد تقیؑ کے علاوہ کسی اور فرزند کے ذریعے سے بھی ہوتی تو امتیاز کے لیے وہ اپنے کو رضوی کہتی اور امام محمد تقیؑ کی اولاد اپنے کو تقوی کہتی، مگر چونکہ امام رضاؑ کی نسل صرف امام محمد تقیؑ سے چلی اور حضرت امام رضاؑ کی شخصی شہرت سلطنت عباسیہ کے ولی عہد ہونے کی وجہ سے جمہور مسلمین میں بہت ہو چکی تھی اس لیے تمام اولاد کا حضرت امام رضاؑ کی طرف منسوب کرکے تعارف کیا جانے لگا اور رضوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان الدین عند اللّٰہ الاسلام

آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ طاب ثراہ

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں ایمان کے بعد نماز کا مرتبہ پیش کش ناظرین کیا تھا۔ آج ہم زکوٰۃ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جس کی اہمیت ہمارے رسول کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ بعض قبائل عرب نے پیغمبرؐ سے صلح کرنے میں یہ شرط پیش کی کہ ہم اسلام اختیار کرلیں گے ہر حکم کی اطاعت کریں گے مگر صرف اتنی خواہش ہے کہ زکوٰۃ سے ہم کو معاف کر دیا جائے تو رسول نے ارشاد فرمایا **لا خیر فی دین لا صلوٰۃ فیہ ولا زکوٰۃ** اس دین میں کوئی اچھائی نہیں جس میں نہ نماز ہو اور نہ زکوٰۃ ہو۔ یا تو تم لوگ یہ بھی منظور کرو نہیں تو میں تمہاری طرف خدا کا تیر پھینکوں گا۔ لوگوں نے عرض کی کہ خدا کا تیر کون ہے تو آپ نے اپنے بھائی علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا کہ یہ ہے سہم اللہ جو کبھی خطا نہیں کرتا۔ علی کا نام سن کر اس قبیلہ والوں کی ہمت پست ہوگئی اور ان لوگوں نے زکوٰۃ دینا بھی منظور کرلی۔ بعد نماز جو چیز تمام مسلمانوں پر سب سے پہلے واجب کی گئی وہ زکوٰۃ ہی ہے۔ زکوٰۃ نہ دینے والوں کے واسطے قرآن کا وعدہ ہے کہ ان کے خزانے جہنم میں گرم کیے جائیں گے اور اس سے کچھ پیشانیاں داغی جائیں گی اور ارشاد ہوگا کہ اس کا مزہ چکھو یہ وہ ہے جو تم نے جمع کیا تھا۔ حدیث کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہ ادا کرے تو اس کی نماز بھی قبول نہ ہوگی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے زکوٰۃ نہ دی تو خدا اسکے مال کو ایک اژدہے کی صورت بنا کر اس کی گردن میں لپیٹ دے گا جو برابر اس کا گوشت کھاتا رہے گا یہاں تک کہ حساب و کتاب سے فراغت ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو لوگ زکوٰۃ نہ دیتے تھے ان کو رسول نے اپنی مسجد سے نکال دیا کہ تم زکوٰۃ نہیں دیتے تو ہماری مسجد میں نماز نہ پڑھو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا نہ وہ مومن ہے نہ مسلم ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کا قتل کر دینا حضور امام میں جائز ہے ایک زنائے محصنہ کرنے والا دوسرے زکوٰۃ نہ دینے والا مگر غیبت امامؑ میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جا سکتا البتہ بعد ظہور امام ایسے لوگوں کو قتل کریں گے۔ ارشاد امام ہے کہ جو اپنے مال سے حق خدا نہیں نکالتا اس کا مال باطل میں خرچ ہو جاتا ہے۔ اس طرح بہت سے احادیث اور روایات زکوٰۃ کے متعلق ائمہ معصومینؑ سے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کتنی ضروری چیز ہے۔

اس زکوٰۃ کی دو قسمیں ہیں ایک زکوٰۃ فطرہ اور ایک زکوٰۃ مال۔ زکوٰۃ فطرہ وہ ہے جو بعد ماہ رمضان یوم عید واجب ہے۔ جس نے روزہ رکھا ہو اس پر بھی اور جس نے کسی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہو اس پر بھی واجب ہے۔ اور زکوٰۃ مال

اونٹ، بھیڑ، بکری، گائے، بھینس پر واجب ہے اور روپیہ، اشرفی، گندم، جو، رطب اور منقے میں واجب ہے۔

زکوٰۃ میں شرط ہے بالغ ہونا، عاقل ہونا، آزاد ہونا، مالک ہونا، تصرف پر قادر ہونا اور بقدر نصاب ہونا۔ اگر ان شرطوں میں کوئی ایک موجود نہ ہوگی تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ہندوستان میں اونٹ، گائے گویا کہ نہیں ہوتے البتہ گائے، بکری، بھیڑ ہوسکتی ہے وہ بھی شاذ و نادر کیونکہ تیس گائے، بھینس اور چالیس بھیڑ، بکری سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور رطب اور منقی بھی یہاں نہیں البتہ صرف اشرفی اور روپیوں میں زکوٰۃ واجب ہے اس میں بھی مذکورۂ بالا شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ سونا، چاندی ہو اور کم از کم چالیس تولہ ۳ ماشہ کے بقدر روپیہ اور ۵ تولہ ۹ ماشہ کے بقدر اشرفی ہو تو چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا چاہیے۔ بشرطیکہ سال بھر ایک حال سے رکھا رہے اور اس صورت سے ہو کہ مالک جس وقت چاہے صرف کرے۔ غلہ میں صرف گیہوں اور جو میں زکوٰۃ ہے جبکہ خود کاشت کیا ہو یا بٹائی سے غلہ حاصل کیا ہو تو جس وقت غلہ حاصل ہو اسی وقت زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر سنچائی کرے تو بیسواں حصہ واجب ہے اور اگر بارش سے یا سیلاب وغیرہ سے پیدا ہوا ہو تو دسواں حصہ واجب ہے اور اگر دونوں صورتوں سے غلہ پیدا ہو تو پندرہواں حصہ نکالے۔ تعداد نصاب یہ ہے کہ صرف جو یا صرف گندم یا دونوں ملا کر اگر کم از کم ۲۳ من ۷ ۲ سیر پیدا ہو تو اس میں اخراجات کا تخمینہ کر کے نکال لے بقیہ میں سے زکوٰۃ نکالے۔

یہ تقریر تو زکوٰۃ کی اہمیت کے متعلق تھی اب ہم کچھ روزے کے متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں۔

روزہ یعنی صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت کر کے کھانا پینا اور تمام روزہ باطل کرنے والی چیزوں کو ترک کرنا واجب تو صرف ماہ رمضان ہی میں ہے مگر ماہ رمضان کے علاوہ جن دنوں میں روزہ حرام ہے یعنی عید، بقرعید اور عاشورہ کے علاوہ جب سنتی روزہ رکھے تو خدا کے نزدیک محبوب ترین عبادت ہے جس کی جزا احادیث میں جنت بتائی گئی ہے۔ یہ روزہ جاڑوں کے ٹھنڈے اور چھوٹے دنوں میں تو کچھ تکلیف دہ نہیں ہوتا البتہ گرمی کے زمانے میں یقیناً اذیت دہ ہوتا ہے۔ مگر خدا کی خوشی کے واسطے اپنے نفس کو روزے کی تکلیف میں مبتلا کرنا ہی تو وہ عبادت ہے جس کے ثواب کی حد نہیں ہے۔ قرآن میں روزے کو صبر کہا گیا ہے اور صابر کے واسطے ارشاد ہے کہ خدا ان کو بے حساب جزا دے گا کسی مقام پر ارشاد ہے کہ میں خود روزے کی جزا دوں گا بعض مقامات پر ارشاد رب العزت ہے کہ میں خود روزے کی جزا ہوں۔ اسی وجہ سے امیر المومنینؑ فرماتے تھے کہ مجھ کو گرمی کا روزہ بہت محبوب ہے اور تمام معصومین سوائے عذر شرعی کے ہر روز روزہ رکھتے تھے۔ روزے کی وجہ قرآن میں یوں بتائی گئی ہے کہ شاید تم روزے کی وجہ سے چند ہی دن تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو قرآن نے اور احادیث نے مسلمانوں کو متقی اور پرہیزگار بنانے کی سب سے زائد کوشش کی ہے کیوں کہ تقوی اور پرہیزگاری ہی وہ صفت ہے کہ جس کے ضمن میں ہر عبادت پر عمل اور ہر گناہ سے بچنے کا ذریعہ حاصل ہوجاتا ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ نہ

عبادت ترک کرے گا نہ کسی بری بات کا مرتکب ہوگا۔ ہر مسلمان زبان سے تو یہ ضرور کہتا ہے کہ ہم خدا سے ڈرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ نوے فیصدی مسلمان خدا سے کچھ بھی خوف نہیں کرتے یا اسکو حاضر و ناظر بھی نہیں جانتے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ کوئی بدکار سے بدکار شخص بھی ہو لیکن اگر وہ کسی سے مثلاً حاکم سے یا استاد سے یا اپنے کسی بزرگ سے ڈرتا ہو اور یہ یقین کرلے کہ وہ حاکم یا استاد اس شخص کو دیکھ رہا ہے تو کبھی کوئی بدکاری نہیں کرتا۔ چور اگر یقین کرلے کہ کوئی پولس والا ہم کو دیکھ رہا ہے تو کبھی چوری نہ کرے گا رعایا کو اگر یقین ہو کہ کوئی حاکم جس کا خوف غالب ہے ہمارا نگراں ہے تو کبھی قانون شکنی نہ کرے گا۔ البتہ جب یہ یقین ہو جائے گا کہ کوئی نہیں دیکھتا یا جو دیکھ رہا ہے اس کا خوف دل میں نہیں ہے تو انسان ہر بدفعلی اور قانون شکنی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ خلفشار میں اہم نکتہ یہی ہے کہ ارکان حکومت کی غفلت، سفارش پر عمل، رشوت ستانی، قومی اور مذہبی جنبہ داری نے رعایا کے دل سے حکام کا خوف یک قلم ختم کر دیا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری بڑی سے بڑی قانون شکنی، جرأت و جسارت پر اول تو حکام توجہ ہی نہ کریں گے اور اگر توجہ بھی کی تو سعی، سفارش، رشوت یا مذہبی جنبہ داری ہم کو بچا دے گی لہٰذا جو قانون شکنی چاہے کرو اور جسقدر بھی آفت مچاؤ کسی سزا کا ڈر نہیں ہے حد یہ ہے کہ قتل و غارت اور آتش زنی کے سے جرموں میں بھی لوگ سزا سے بچ جاتے ہیں اس لئے سیکڑوں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد تو جمہوریت کا ایک پس منظر یہ بھی ہے ہر قانون شکنی کی ہمت افزائی کو کوئی نہ کوئی جماعت ضرور ہوتی ہے جس کے مقابلہ میں ہر جمہوریت کو سر جھکا کر اپنی بے بسی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور رعایا کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔ قانون شکنی اور بدامنی بے خوفی کی وجہ سے عام ہوتی جاتی ہے اور عام ہوتی رہے گی اسی وجہ سے قرآن و احادیث نے اللہ کو حاضر و ناظر جاننے اور اس سے ڈرتے رہنے کی سب سے زائد تعلیم دی ہے جس کا زبردست ذریعہ روزہ ہے۔

قرآن مجید میں روزے کا فائدہ **لعلکم تتقون** سے ظاہر کیا گیا ہے یعنی شاید تم چند ہی دن تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ دراصل خواہشات نفس سے بے قابو ہو جانا ہر برائی کی اصل ہے اور خواہشات نفس کو اپنے قابو میں رکھنا تمام حسن عمل کی بنیاد ہے۔ انسان بھوک سے بے چین ہو کر وہ باتیں کرنے لگتا ہے جو اس کی خودداری بلکہ بعض وقت شان انسانیت کے مناسب نہیں ہوتیں۔ پیاس سے بے قابو ہو جاتا ہے، غصہ سے بے قابو ہو کر وہ حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس کا افسوس عمر بھر ختم نہیں ہوتا مگر خواہشات حیوانی سے بے چین ہو کر ایسی ایسی بدکاریاں کرنے لگتا ہے جو اس کو جانور سے بھی بدتر ثابت کر دیتی ہیں۔ بہت سی برائیوں کے جواز میں اپنی عادتوں کا حیلہ ڈھونڈھتا ہے۔ مگر روزہ وہ عملی تعلیم ہے جس کے قواعد و شرائط اگر پیش نظر رکھے جائیں تو انسان میں ہر وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر جذبہ اور خواہش پر قبضہ اور اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ اگر کہوں تو شاید بے محل نہ ہوگا کہ جس طرح تعلیم کے بعد کامل مہارت حاصل کرنے کے واسطے ٹریننگ کا درجہ قائم کیا گیا ہے اسی طرح شریعت نے بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کی انتہائی تعلیم دینے

کے بعد روزے کو محض علمی حدود تک باقی نہ رکھا بلکہ عملی صورت سے تقویٰ کی راہوں پر لگا دینے کی صورت پیدا کی۔
اسی روزے کے ذریعہ سے انسان کو بھوک، پیاس پر صبر کی عادت پڑتی ہے۔ تمام خواہشات حیوانی قابو میں رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چائے کی عادت ہو یا تمباکو، سگریٹ کی عادت یا حقہ کی ہر عادت چھوڑنا پڑتی ہے اور گویا قدرت کی طرف سے بتایا جاتا ہے کہ عادت سے مجبور ہو جانے کا عذر کوئی معقول عذر نہیں ہے اگر انسان قصد کرے تو عادت چھوڑ بھی سکتا ہے۔ کامل روزہ یہ ہے کہ آنکھ ان چیزوں پر نہ پڑے جن کی ممانعت ہے، کان سے وہ باتیں نہ سنے جو حرام ہیں، زبان سے وہ لفظیں نہ نکلیں جن کی ممانعت ہے، ہاتھ وہ کام نہ کریں جو ناجائز ہیں۔ غصہ نہ کرے، جہاں تک ہو رحم وکرم سے کام لے۔ پس اگر ان باتوں کی ایک ماہ تک عادت ڈال لے تو باقی گیارہ مہینوں میں بھی اس عادت سے کام لینا ممکن اور آسان ہو جائے گا۔

اسی صوم کی وجہ سے انسان کو فقراء ومساکین کے مصائب کی قدر ہوتی ہے اور ان سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے احکام مذہب پر موقوف نہیں انسان کا تجربہ اور عقل خود بتاتی ہے کہ تزکیۂ نفس کے واسطے روزے سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

چنانچہ کئی مرتبہ گاندھی جی نے بھی اپنی غلطیوں پر تزکیہ نفس کے واسطے برت رکھا اور تقریباً ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت سے روزے کی تعلیم موجود ہے انہیں وجوہ کی بناء پر شریعت اسلام نے بھی روزے کی بہت تاکید کی ہے یہاں تک کہ اس کو رکن ایمان قرار دیا ہے روزہ ضروریات دین میں سے ہے جو اس کے واجب ہونے سے انکار کرے وہ اسلام سے خارج ہے۔ معصوم سے ایک شخص نے عرض کی کہ ایک شخص عمداً بلا عذر ماہ رمضان کا روزہ ترک کرتا ہے آپ نے فرمایا کہ اس سے دریافت کرو کہ آیا وہ اپنے کو روزہ ترک کرنے میں گناہ گار سمجھتا ہے یا نہیں اگر کہے کہ وہ اپنے کو گناہگار نہیں سمجھتا (جس کا مطلب ہے کہ وہ روزے کو واجب ہی نہیں سمجھتا تو وہ کافر ہے) تو امام کا فرض ہے کہ اس کو قتل کر دے اور اگر وہ کہے کہ اپنے کو گناہ گار سمجھتا ہے تو اس کو تنبیہ کی جائے گی۔ دوسری حدیث ہے کہ اگر دو مرتبہ امام تنبیہ کر چکا اور کچھ سزا دے چکا اس کے بعد بھی کوئی شخص عمداً بلا عذر کے روزہ ترک کرے تو امامؑ ایسے شخص کو بھی قتل کر دیں گے۔ ایک روزے کے ترک کا کفارہ یہ ہے کہ یا ایک غلام آزاد کرے یا ساٹھ فقراء مومنین کو کھانا کھلائے یا ایک روزے کے عوض میں ساٹھ روزے پے در پے بلا فاصلہ رکھے۔

حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا اسوۂ جاوید

عمادالعلماء علامہ سید علی محمد نقوی مدظلہ

اسلام میں عورت پہلے اپنی نسوانیت اور اپنے عورت پن کا تحفظ کرتی ہے اور اپنی مخصوص ذمہ داریوں یعنی اولاد کی تربیت اور صحیح و سالم نسل کی افزائش فراموش نہیں کرتی، خدمت دین و خدا و انسان، جدو جہد اور کوششیں غرضکہ معاشرہ کے ہر موڑ پر مردوں کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنی برتری، اپنی قدر و منزلت اور اپنا احترام برقرار رکھتی ہے۔

حضرت فاطمہ صلوات اللہ علیہا منارۂ عظمت ہیں اور اسلام کے نسوانی معاشرہ کے لیے لازم ہے کہ ان کے کردار اور ان کے اسلوب کی پیروی کرے۔ اسلام میں عورت کا جو تصور ہے حضرت فاطمہ اس کی مکمل ترین تصویر اور اسلام میں عورت کی جو رفعت و منزلت ہے اس کی کامل مظہر ہیں۔

حضرت فاطمہ عورت ہونے کے باوجود آیہ تطہیر کی مصداق ہیں، پنجتن کی ایک فرد ہیں جو مباہلہ میں پیغمبر اسلام کے ہمراہ تھیں اور تاریخ اسلام کی چودہ مقدس ترین و عظیم ترین شخصیتوں مس سے ایک ہیں۔ انہوں نے یہ بتا دیا کہ ایک عورت کس طرح روحی، فکری اور نظریاتی ارتقا کی بلندی تک پہنچ سکتی ہے۔ حضرت فاطمہ وہ خاتون ہیں جنھیں اسلام نے تمام انسانوں کے لیے ایک نمونہ اور مثالیہ بنا کر پیش کیا ہے۔

جو عظمت و منزلت جناب فاطمہ پیغمبر اسلام اور تمام مسلمانوں کے نزدیک رکھتی ہیں اسلام میں عورت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

شیعہ سنی تمام روایتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ جناب فاطمہ پیغمبر اسلام کے نزدیک محبوب ترین فرد تھیں اور رسول خدا ان سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ حاکم نے 'مستدرک' میں ثعلبہ سے نقل کیا ہے کہ ''رسول خدا جب بھی سفر یا جنگ سے لوٹتے تھے تو مسجد کے بعد سب سے پہلے جناب فاطمہ کے پاس جاتے تھے'' ابن سعد نے اپنی کتاب 'شرف النبوۃ' میں لکھا ہے کہ پیغمبر نے کہا اے فاطمہ اللہ تعالیٰ تمہارے غصہ سے غضبناک ہوتا ہے اور تمہاری خوشنودی سے خوش ہوتا ہے۔'' کتاب 'استیعاب' میں لکھا ہے کہ عائشہ سے لوگوں نے پوچھا کہ رسول خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟ جواب دیا ''فاطمہ'' اور ترمذی میں اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ پیغمبر نے کہا ''فاطمہ میرے نزدیک محبوب ترین فرد ہیں'' یہ تمام عظمت، اہمیت اور احترام جو جناب فاطمہ کا پیغمبر کے نزدیک تھا یا جو تعلق رسول خدا کو جناب فاطمہ سے تھا اس کی وجہ محض باپ اور بیٹی کا رشتہ ہی نہ تھا۔ کیونکہ پہلی

بات تو یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ایک عام انسان نہ تھے بلکہ ایسے فرد تھے جن کے متعلق قرآن فرماتا ہے ''وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ'' یعنی پیغمبر جو کہتے یا کرتے ہیں مرضی و منشائے الٰہی کے عین مطابق ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک باپ فطری طور پر اپنی بیٹی سے الفت ومحبت کرتا ہے نہ کہ اس کا خصوصی احترام۔ اس کی تعظیم کرنا اور اسے ''ام ابیھا'' یعنی باپ کی ماں کہنا اور اعلان کرنا کہ اس کا غصہ خدا کے عتاب کو برانگیختہ کرتا ہے اور اس کی خوشی خدا کوخوش کرتی ہے اس بات پر دال ہے کہ رسول خدا جناب فاطمہ کی عظمت کردار، ان کے فرائض و بلند مقاصد اور ان کی شخصیت معنوی کی وجہ سے ان کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت ہونا فضیلت کو سلب نہیں کرتا بلکہ اگر عورت صاحب فضائل انسانی و معنوی ہے تو مردوں سے زیادہ اس کی عظمت ممکن ہے۔

خود پیغمبر اسلام جب جناب فاطمہ کی اس قدر تعظیم اور احترام کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہر زمانہ اور ہر حصے کے مسلمان جناب سیدہ کے لیے کس قدر عظمت و احترام کے قائل ہوں گے۔ تمام علمائے اسلام نے جناب فاطمہ کی خاک پاک ہونا بھی باعث فخر سمجھا ہے اور انھیں اعجاز قرآن کا ثابت کرنے والا اور پیغمبر اسلام کے دعوے رسالت کی صحت پر گواہ تسلیم کیا ہے کیوں کہ جناب فاطمہ زہرا وہ واحد رشتہ دار ہیں جن کے توسط سے پیغمبر اسلام کی نسل دنیا میں محفوظ ہے۔ قرآن کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور کفر رسوا ہوا۔ کفار اور مشرکین کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام مقطوع النسل ہیں یعنی نسل ان پر ختم ہوگئی ہے جبکہ قرآن حکیم اعلان کرتا ہے کہ ''انا اعطینک الکوثر'' یعنی ہم نے تمہاری نسل کو کثرت عطا کی اور تمہارے تمام دشمن ابتر ہیں۔ اور یہ کوثر رسول خدا کو جناب سیدہ کی صورت میں عطا کی گئی، اس طرح مومنین اور علمائے اسلام کے نزدیک جناب فاطمہ صرف محبوب خدا کی صاحبزادی ہی نہیں ہیں بلکہ اسلامی شخصیتوں میں مقدس ترین شخصیت قرآن ناطق، صحت دعویٰ رسالت کی گواہ اور ثابت کنندۂ اعجاز قرآنی بھی ہیں۔

جناب فاطمہ زہرا اس عظمت روحانی کی حامل ہیں کہ انھیں 'بتول' کہا گیا ہے۔ بتول ایسی خاتون کو کہتے ہیں جس کے رشتے دنیا سے منقطع اور حق سے استوار ہوجاتے ہیں۔ 'مجمع البحار' میں آیا ہے کہ حضرت مریم اور جناب فاطمہ صلوات اللہ علیہا دونوں کو بتول کہتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں مقدس خواتین وہ تھیں جن کے رشتے دنیا سے منقطع ہوکر حق سے استوار ہو چکے تھے۔ حضرت فاطمہ کو مسلمان، صدیقہ، مبارکہ، راضیہ اور مرضیہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں کیوں کہ ان میں سے ہر لقب ان کی عظمت کے کسی نہ کسی رخ کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک طرف تو جہاں فاطمہ زہرا مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ ہیں، ایسی خاتون جیسی اسلام چاہتا ہے۔ ایسی نمونہ خاتون جسے پیغمبر اسلام نے خود اپنے دست مبارک سے سانچہ میں ڈھالا اور اپنی پر التفات تربیت کے زیر سایہ پروان چڑھایا۔ دوسری طرف وہ اسلام میں خواتین کی برتری اور سربلندی کی مظہر بھی ہیں۔

دینی مدارس کی اصلاح!

خطیب انقلاب مولانا حسن ظفر نقوی اجتہادی (کراچی)

ان باایمان اور ذمہ دار اساتذہ سے انتہائی معذرت کے ساتھ کہ جو دیانتداری اور دردمند دل کے ساتھ مستقبل کے علماء کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ باایمان اور باصفا اساتذہ بھی میری اس بات کی تائید کریں گے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح اس مقدس شعبے میں بھی پروفیشنل ازم (کاروباری انداز) گھس آیا ہے۔

بعض مدارس کا یہ حال ہے کہ یہ یہ کچھ لوگوں کی دکانیں ہیں جہاں قوم و مذہب کی خدمت سے زیادہ اپنے اور اپنے آنے والے بچوں کے لیے ٹھکانہ مقصودِ نظر ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسجد اور مدرسہ کو اپنی میراث سمجھ لیا جاتا ہے۔ پیش امام چاہتا ہے کہ میری اولاد قابل ہو یا نہ ہو مسجد کی امامت میرے پاس یا میرے بچوں کے پاس ہی رہنی چاہیے۔ ہمارے بعض بہترین دینی مراکز صرف اس لیے غیر معیاری ہو گئے کہ بزرگ علما کے جانے کے بعد وہاں نااہل افراد قابض ہو گئے۔

سب سے پہلے مدارس کو ذاتی ملکیت کی قید سے باہر نکالا جائے۔ وہ کیسے ہوگا؟

دراصل سارا جھگڑا ان مفادات کا ہے جو مدرسے کے ذریعے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ خمس ہمارے اداروں کی بقا اور ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اسی خمس کا غلط استعمال ہونے لگے تو نہ صرف یہ کہ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ غرباء و فقراء بھی بے آسرا رہ جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس ابتلا اور مذہب سے دوری کے دور میں بھی اربوں کے حساب سے خمس نکالا جاتا ہے۔ خمس پر چند مولویوں اور چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ مال امام مدارس کی اور اجازہ رکھنے والے مولویوں کی نذر ہو جاتا ہے اور سہم سادات کے مستحق سادات کی ایک فیصد تعداد کو بمشکل ان کا حق پہنچ پاتا ہے۔ خمس لیتے وقت تو ساری زندگی کا حساب آپ سے لیا جاتا ہے۔ آج تک ہمارے ملک میں کسی نے وصول کئے جانے والے خمس کا بھی حساب دیا؟ یہ تو ہر شخص کو کہتے سنا ہے کہ ہمارے پاس فلاں فلاں مراجع عظام کی طرف سے خمس لینے کی اجازت ہے لیکن یہ آواز کہیں سے نہیں آتی کہ مستحق افراد خمس کے لئے ہم سے رجوع کریں۔

کیوں؟ کیا صرف ایک عام مومن امام کا جواب دہ ہے علماء نہیں؟ یقیناً علماء کی جواب دہی سب سے زیادہ ہے کاغذ کا ایک پرزہ جسے اجازے کا نام دیا گیا ہے اس پر بھی مرجع تقلید یہی لکھتا ہے کہ انتہائی احتیاط سے مربوط امور میں خرچ کرنے کے بعد اپنی معاشی ضرورت کو بھی صاحب اجازہ پورا کر سکتا ہے۔ بس اس ایک آخری جملے نے مصیبت کر دی۔ اب ایک مولوی کی معاشی ضرورت کیا ہے اس کی کوئی حد بندی نہیں ہے یا تو اس کا کوئی نہ کوئی کروڑوں روپے کا پروجیکٹ ہوتا ہے اور پھر اس پروجیکٹ کے بعد اس کی عیال کی معاشی ضروریات، تو پھر اب ظاہر ہے کہ غریب آدمی کہاں جائے، اس کی ضرورت کون پوری

کرے؟ دوسری طرف کچھ علماء اور ذمہ دار مخیر حضرات غربا اور فقرا کی سرپرستی اور امداد کرتے ہیں تو سارا بوجھ بشمول الزامات اور تہمتوں کے ان کے سر پر آپڑتا ہے۔ اگر اس خمس کے آنے اور جانے دونوں کا حساب ہونے لگے تو یقیناً قوم تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے گی۔

لہٰذا اس خمس کو مرکزیت (centralization) حاصل ہونا چاہیے، لینے کا بھی اور دینے کا بھی حساب ہونا چاہیے۔ ضرورت کے مطابق مدرسوں کا قیام ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جہاں دل چاہے، جس کا دل چاہے خمس کی دکان سجا کر اور خمس کا مال سمیٹ کر مدرسہ کھول کر بیٹھ جائے۔ علماء کے وظائف ان کی ضروریات کے مطابق ہوں، تحقیقی مراکز کا قیام ہو جہاں علماء مختلف میدانوں اور موضوعات پر تحقیقاتی خدمات انجام دے سکیں۔ جدید علوم بالخصوص کمپیوٹر، سائنس کے مراکز کا قیام، میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز اور یونیورسٹیز کا قیام، اسپتالوں کا قیام، بیواؤں، یتیموں اور نادار انسانوں کی سرپرستی، قوم کے بچوں کو لازمی طور پر تعلیمی زیور سے آراستہ کرانا، اسیروں کی دیکھ بھال، کون سا مسئلہ ایسا ہے جو ہم خمس کے ذریعے حل نہیں کرسکتے مگر اس کا صحیح استعمال تو ہو۔ میں اس فکر میں تنہا نہیں ہوں بلکہ بعض بزرگ علماء بھی میری اس فکر کی تائید کرتے ہیں۔

بظاہر میری بات نئی اور عجیب لگے گی مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں یہ ساری قوم کی آواز ہوگی۔ جس طرح خمس نکلوانے کے لئے لوگوں کو تبلیغ اور ترغیب دی جاتی ہے بالکل اسی طرح خمس وصول کرنے والوں کو بھی پابند کرنا پڑے گا کہ وہ خود ہی سالانہ وصول کئے گئے خمس کا حساب شائع کریں۔ یہی خمس کی غیر منصفانہ تقسیم اداروں اور افراد میں رسہ کشی کا باعث ہی نہیں بن رہی بلکہ درباری ملاؤں کی پیداوار میں مسلسل اضافے کا باعث بھی بن رہی ہے۔ کیونکہ یہی مال و زر علماء کو سرمایہ داروں کے در کا گدا بنا دیتا ہے اور عوام کو علماء کے در کا (عوام کو علماء کے در کا گدا ضرور ہونا چاہیے مگر اس انداز سے نہیں جو مال حاصل کرنے کے لیے اپنایا جاتا ہے)

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس دین کے سچے اور مخلص محافظوں کی پرورش کریں تو ہمیں مدارس کے نظام میں بھی کچھ تبدیلی کرنا ہوگی، تمام مدارس میں ایک درسی نظام قائم کرنا ہوگا۔ مدرسے میں داخلہ لینے والے طلباء کا ایک معیار قائم کرنا ہوگا، علاقائی ضرورت کے مطابق مدارس قائم کرنے ہوں گے۔ اس مدرسہ کا کوئی مالک نہیں بلکہ منتظم اعلیٰ ہو جس کی مدت مقرر ہونا چاہیے۔ یہ منتظم کا منصب ورثہ میں نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ملنا چاہیے اور اس اہلیت کا فیصلہ علماء کا ایک بورڈ کرے۔ تمام شہروں میں مدارس کے قیام کے بعد کسی ایک شہر میں ایک ''علمی شہر'' جسے یونیورسٹی کہیے یا حوزہ علمیہ کہیے دینی طلاب کی اعلیٰ تعلیم یعنی اجتہاد کے لئے ہونا چاہیے۔

ضروری نہیں کہ سارے طلاب دوسرے ممالک میں پڑھنے کے لئے جائیں اور نہ ہی آج کے دور میں یہ ممکن ہے کہ یہاں کے سارے طلاب کو دوسری جگہوں پر داخلے مل جائیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے دوسرے ممالک سے قابل اساتذہ کو بلایا جائے۔ آخر نصف صدی پہلے تک برصغیر میں اجتہاد ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن جب ہمارے مدارس کی سوچ ہی محدود ہو ان میں خود ہی آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو اور استاد اس بات سے ڈرتا ہو کہ شاگرد کہیں مجھ سے آگے نہ نکل جائے تو پھر ایسے مدارس سے توقعات فضول ہیں۔ وہ معاشرے کو مسائل کے بوجھ سے تو کیا آزاد کراتے ہیں بلکہ خود معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

ماں

جناب سید محمد یوسف صاحب

ماں ـــ محور ماحول لطیف، ستون کاشانۂ حیات زیب وزینت خانہ، مرکز امید وآرزو۔ جس کی ماماتا لامحدود، جس کی محبت قید وبند سے آزاد۔ **ماں!** جس کا انداز پرورش بچے کے عمدہ کردار کا ضامن، جس کا سایہ بچے کی زندگی کی رونق اور جس سے محرومی زندگی کے لئے قید خانہ۔ جو خود مصیبتیں جھیل کر بچوں کو پالتی ہے، خود تکالیف اٹھا کر بچوں کو راحت پہنچاتی ہے، خود مصائب وکشمکش حیات کا مقابلہ کرکے بچے کو حیات نو بخشتی ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔

ماں ـــ جو اپنی تمناؤں کا جنازہ نکال کر بچوں کی تمنا پوری کرتی ہے۔ اپنی آرزوؤں کی قربانی دے کر بچوں کے گلشن آرزو کو پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ جس کو بچوں کی خاطر خوشی سے جان دینا گوارا۔ جو خود پتھریلی، کھردری اور ریتیلی زمین پر لیٹ کر بچوں کو اپنے گداز جسم پر لٹا کر اور لوریاں سنا کر نیند کے آغوش میں دیدیتی ہے۔ جس کی آنکھیں بچے کو خوش اور بشاش دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں اور وہی آنکھیں بچے کو مبتلائے غم دیکھ کر آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔ جس کی جستجو: ''میرا بچہ بڑا ہوکر سماج میں ایک معزز شخصیت کا مالک بنے'' جس کی آرزو: ''میرا بچہ پھلے پھولے اور بڑھے''

ماں ـــ جو بچے کی ابدی حیات کی طالب رہتی ہے۔ وقت اجل بھی جس کے خشک لبوں پر یہی الفاظ جاری رہتے ہیں ''پالنے والے! میرے بچے دشمنوں سے دور، حوادث سے محفوظ اور زنجیر بیماری سے آزاد رہیں۔ یارحمٰن، یارحیم! میرا یہ ادنیٰ سا گلشن جس کو میں نے خون سے سینچا ہے، سدا سرسبز وشاداب رہے۔ یہ پنجۂ خزاں سے دور رہے۔ اے مالک حقیقی! اگر ان پر کوئی افتاد پڑتی، مصائب وآلام کا پہاڑ ٹوٹتا یا کوئی ناخوشگوار واقعہ کا خدشہ بھی لاحق ہوتا تو میں تیرا نام لے کر اپنی چادر میں ان کو چھپا لیتی تھی۔ ان کو اپنے سینہ سے لگا لیتی تھی۔ تیری عطا کی ہوئی طاقت ان کی حفاظت میں صرف کردیتی تھی۔ لیکن آج تو اپنی مشیت و مصلحت سے ان کی اس پناہ گاہ کو ان سے چھین رہا ہے۔ اے پروردگار! میں تیری اس امانت کو جس کی نگہداشت کے لئے تو نے پیمانۂ دل کو محبت والفت سے لبریز کرکے رتبۂ مادری عطا کیا تھا اور کچھ امانتیں پرورش وتربیت کے لئے دی تھیں انھیں آج اب تیری ہی حفاظت میں چھوڑ کر واپس آرہی ہوں لیکن ایک دلی خواہش کے ساتھ ''اے کاش! یہ مرقع سدا بہار رہے، تیرا کرم ہمیشہ سایہ فگن رہے۔'' بوڑھی، غمزدہ اور بھاری بھاری پلکیں دو ستاروں کو جن کی روشنی مدھم ہوچکی ہوتی ہے ڈھانپ لیتی ہیں۔ بند ہوتی ہوئی آنکھیں بچوں کو بھی ایک پیغام دیتی ہیں ''بچو! میں نے تم سب کو اللہ کو سونپا۔ تم سب کا اللہ نگہبان ہے۔ دیکھو ـــ میرا سب سے پہلا سبق یاد ہے نا ـــ لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ جیسے کہہ رہے ہوں اب آخر وقت پھر سن لو پیاری شریعت کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا کبھی گمراہ نہ ہوگے۔''

ماں ـــ جس کو آخر دم تک بچے کی بھلائی کی فکر رہتی ہے، سماج کی بھی وہ مایہ ناز اور جلیل القدر ہستی ہے جس کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

اگر بچے کی ولادت کے بعد اس ایک شئے کے

بدلے سونے کا ڈھیر دے دیا جائے تو جیسے ایک کھلا ہوا اور مہکتا گل چھین کر کاغذ کا پھول دے دیا ہو۔ جیسے صیاد نے بلبل سے باغ وگل چھین کر اس کو ایک قفس میں بند کر دیا ہو جس میں اب اس کو باقی عمر بسر کرنی ہو یا کسی عروس نو کو جڑاؤ زیورات دے کر اس کی تمناؤں کا خون کر دیا ہو اور ولولوں کو کچل دیا ہو۔

زمانۂ رسالت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن جبکہ آفتاب اپنی مسافت ختم کر رہا تھا، اس کی تمازت کافی کم ہو چکی تھی، اس کی سنہری کرنیں زمین پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ آفتاب نبوت اپنے چند اصحاب کے جھرمٹ میں ضوفشاں ایک مسافت طے کر رہا تھا۔ محبوب سبحانی کے چہرے سے نور ہویدا تھا جیسے زمین پر چاند اتر آیا ہو۔ ساکت آسمان صاحب معراج کے قدموں پر نظر جمائے تھا اور زمین کو فخر تھا کہ صاحب مکارم الاخلاق اس کے سینہ پر قدم رنجہ ہیں۔

رسول کریمؐ کا گزر ایک قبرستان سے ہو رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا کارواں آگے بڑھ رہا ہے اور گرد کارواں کسی واقعہ کی خبر رسانی کر رہی ہے۔ دفعتاً میر کارواں کے قدم رکے اور صحابہ کی استفسارانہ نگاہیں رسولؐ کے چہرے پر جم گئیں۔

سب کی نگاہوں نے رسالت مآب کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دور ایک قبر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے جا ٹکرائیں۔ ہاں دھواں سیاہ، اشک آور اور خطرناک دھواں۔

''مولا یہ دھواں کیسا ہے؟ ـــ عذاب کا نتیجہ ـــ عذاب ـــ ہاں ـــ

اور یہ چار حروف نے ایک ہیجان برپا کر دیا۔

یہ کس کی قبر ہے ـــ؟ ـــ ایک ضعیفہ کے پسر کی ـــ اس کے گھر سے واقف ہو ـــ؟ ـــ جی ہاں ـــ اس ضعیفہ کو بلاؤ ـــ لبیک ـــ یا رسول اللہ

کچھ دیر بعد جب ضعیفہ آئی تو اس کی مغموم و ضعیف آنکھیں قبر سے آشکار دھوئیں کو برداشت نہ کر سکیں۔

''مولا ـــ دھواں ـــ یہ تو میرے بیٹے کی قبر سے نکل رہا ہے ـــ ہاں ـــ عذاب کا نتیجہ ہے ـــ

رسول مقبولؐ نے اپنی عبا کا دامن قبر پر ڈال دیا۔ ضعیفہ نے جھک کر دیکھا ـــ کرب و بے چینی میں مبتلا پسر ـ یا رحمۃ للعالمین! ـــ اس کے حق میں دعا فرمائیں ـــ کیا اس نے تیرے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا تھا؟ ـــ ''عمر میں ایک مرتبہ ـــ صرف ایک مرتبہ ـــ میرے ہاتھ کو طیش میں جھٹکا تھا'' ـــ یہ اسی کا لازمی نتیجہ ہے ـــ!!'' اس کو بچایئے مولا ـــ اس کے حق میں دعائے مغفرت کیجئے'' ـــ پہلے تو ماں کی حیثیت سے اس کے فعل کو معاف کر!

مامتا جوش میں آئی، ضعیفہ نے نیلگوں آسمان کے نیچے دونوں ہاتھ بلند کئے، اشک آلود نگاہیں اوپر کو اٹھیں اور لبوں نے جنبش کی:

''اے رب العالمین! میں نے اس کو معاف کیا۔ اے قادر مطلق! میں تیری بارگاہ میں اس کی مغفرت کی طالب ہوں۔''

رحمۃ للعالمینؐ کے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں بلند ہوئے ـــ نگاہیں آسمان سے ٹکرائیں ـــ محبوبؐ نے خواہش ظاہر کی اور قادر مطلق نے فوراً دعا مستجاب کی ـــ دھواں جیسے اس قبر سے اٹھا ہی نہ تھا۔

یہ ہے ماں کا مرتبہ ـــ اب ذرا اپنے قلب کی گہرائیوں میں دیکھئے کہ ہمیں ماں کے مراتب کا کتنا احساس ہے ہمیں اس کا کتنا لحاظ ہے۔ کاش! اس میں اضافہ ہوتا رہے۔

ہم پنجگانہ نمازیں تین وقت میں کیوں پڑھتے ہیں؟

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی، آیت اللہ جعفر سبحانی مدظلہما العالی

سوال:۔اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ''ظہر اور عصر'' یا ''مغرب اور عشاء'' کی نمازیں ملا کر اور ایک وقت میں ادا کرتے ہیں جب کہ ان نمازوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص وقت ہے اور اسلام کے بزرگ پیشوا ان میں سے ہر نماز کو اس کے اپنے وقت پر یعنی پنجگانہ نمازوں کو پانچ وقت میں پڑھا کرتے تھے؟

جواب:۔اس امر میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ نماز کا پانچ وقت قائم کرنا اور ہر نماز اس کے فضیلت کے وقت میں ادا کرنا رسول اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ اور صدر اسلام کے عام مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے اور وہ عموماً پانچ نمازیں پانچ وقت میں پڑھا کرتے تھے۔

اس معاملے میں کوئی کلام نہیں لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا ''تفریق'' اور دو نمازوں کے درمیان فاصلہ رکھنا واجب ہے (جیسا کہ اہل سنت کے بہت سے فقہاء قائل ہیں) یا یہ ایک مستحب کام ہے اور کیا دوسرے مستحبات کی طرح جنھیں انجام دینے یا ترک کرنے میں انسان مختار ہے، وہ نمازیں بھی ملا کر یا علیحدہ علیحدہ پڑھنے پر مجبور نہیں خواہ ان کا علیحدہ علیحدہ پڑھنا بہتر ہی کیوں نہ ہو؟

شیعہ علماء نے ان احادیث کی پیروی کرتے ہوئے جن سے رسول اکرمؐ کے عمل کا پتا چلتا ہے اور ان روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ائمہ اہلبیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں اور آیات قرآنی کے ظواہر پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تمام اسلامی ادوار میں نمازوں کے درمیان تفریق کو مستحب سمجھا ہے اور لوگوں کو بتایا ہے کہ نمازوں کے درمیان فاصلہ رکھنا اور ہر نماز اس کے فضیلت کے وقت میں ادا کرنا مستحب اور افضل ہے لیکن اس کے باوجود اس مستحب کو ترک کیا جا سکتا ہے اور مستحب کے معنی بھی یہی ہیں۔

بلاشبہ دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان میں سے ایک نماز کو دوسری کے وقت میں پڑھتے ہیں مثلاً اگر ہم مغرب اور عشاء کی نماز رات کے پہلے حصے میں پڑھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عشاء کو اس کے صحیح وقت کے علاوہ کسی وقت میں بجالائے ہیں بلکہ ہم نے دونوں نمازیں ان کے مشترک وقت میں پڑھی ہیں کیونکہ مغرب کے آغاز سے آدھی رات تک دونوں نمازوں کا وقت شروع ہوجاتا ہے (بجز اس کے کہ مغرب کی ابتداءً تین رکعتیں پڑھنے کا وقت نماز مغرب کے لیے اور آخر سے اندازاً چار

رکعت پڑھنے کا وقت عشاء کے لیے مخصوص ہے اور باقیماندہ وقت دونوں نمازوں کے مابین مشترک ہے) اور ہم جب بھی عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر یعنی اول شب میں یا مغرب کو آخر وقت میں نماز عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھیں دونوں نمازیں ان کے اپنے وقت میں ادا کرتے ہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ نمازی مغرب کو رات پڑتے ہی اور نماز عشاء کو زوال شفق کے بعد بجالائے اور اگر کوئی شخص اس شرط کی رعایت نہ کرے تو وہ فقط ایک مستحب کو ترک کرتا ہے۔

دو نمازیں ملا کر پڑھنا کیوں جائز ہے؟

دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے جواز کے لیے ہماری دلیل اور گواہ وہ حدیثیں ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں اور جنھیں مرحوم شیخ حر عاملی نے اپنی کتاب (وسائل الشیعہ، کتاب صلوٰۃ کے نمازوں کے وقت سے متعلق ابواب [باب ۳۲ اور ۳۳]) میں جمع کیا ہے۔

تاہم یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ فقط شیعہ محدثین نے ہی یہ احادیث نقل نہیں کیں بلکہ اہل سنت کے محدثین نے بھی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے جواز کے بارے میں (حتیٰ کہ ایسے مواقع پر جب کوئی عذر بھی درپیش نہ ہو) رسول اکرمؐ سے روایت نقل کی ہیں اور اپنی معتبر کتابوں میں ابن عباس، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر سے مروی تقریباً دس ایسی روایات کا ذکر کیا ہے جن کی تمام جزئیات نقل کرنے کے گنجائش نہیں ہے اور ہم ان میں سے فقط چند ایک کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ دنیائے اہل سنت کے معروف محدث احمد بن حنبل اپنی مشہور کتاب میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

''صلی رسول اللہ (ص) الظھر والعصر جمیعاً والمغرب والعشاء جمیعاً من غیر خوف ولا سفر'' (مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۲۱)

یعنی رسول اکرمؐ ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء، دشمن کے خوف یا سفر جیسے عذر کے بغیر باہم ملا کر بجالائے۔

۲۔ پھر یہی محدث جابر بن زید کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ:

''میں رسول اکرمؐ کے ساتھ نماز ظہر و عصر کی آٹھ رکعتیں اور نماز مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ملا کر بجالایا ہوں۔'' اور یہ حدیث ابن عباس سے مختلف عبارتوں میں نقل کی گئی ہے۔

۳۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کتاب میں عبداللہ شقیق سے نقل کرتے ہیں کہ:

''ایک دن ابن عباس لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے اور ان کی تقریر نے اتنا طول کھینچا کہ ستارے آسمان پر نمودار ہوگئے۔ بنی تمیم کے ایک شخص نے اٹھ کر اعتراض کے طور پر کہا:

الصلوٰۃ، والصلوٰۃ

یعنی اب نماز مغرب کا وقت ہے اور اگر تقریر جاری رہی تو اس کا وقت ختم ہو جائے گا۔

ابن عباس نے اس شخص سے کہا:

''میں رسول اکرمؐ کی سنت اور روش سے تم سے

زیادہ واقف ہوں۔ میں نے دیکھ رکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے ظہر اور عصر کی نماز اور اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں ملا کر پڑھی ہیں۔''

راوی کہتا ہے کہ مجھے اس بارے میں شک ہوا اور میں نے اس معاملے کا ذکر ابو ہریرہ سے کیا۔ اس نے ابن عباس کے قول کی تصدیق کی۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۲۵ کتاب موطا مالک کے شارح زرقانی نے اپنی شرح میں اس سے ملتا جلتا مضمون جلد ا صفحہ ۲۶۳ پر درج کیا ہے۔)

۴۔ مشہور محدث مسلم بن الحجاج القشیری (متوفی ۲۶۱ ہجری قمری) نے اپنی صحیح میں ''جمع نماز در حضر'' (حضر میں نمازوں کا ملا کر پڑھنا) کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں اس موضوع پر چار روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے تین ابن عباس پر اور ایک معاذ بن جبل پر ختم ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۱) ان چار حدیثوں کا مضمون بھی جو کچھ اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے مطابق ہے اور ان روایات میں ایک نئے نکتے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب راوی ان نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ:

''اراد ان لایحرج امته''

یعنی آپ اپنی امت کو زحمت اور مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

یہ وجہ شیعہ روایات میں بھی وارد ہوئی ہے اور اس باب میں جو روایات امام صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں ان میں بھی یہ نکتہ موجود ہے۔ (وسائل الشیعہ کتاب صلوٰۃ ابواب وقت باب ۳۲، احادیث ۲، ۳، ۴، ۷)

اس مسئلے (یعنی دو نمازیں ملا کر پڑھنے) کے راوی ابن عباس اور معاذ تک محدود نہیں ہیں۔ طبرانی عبد اللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ظہر اور عصر کو اور نماز مغرب و عشاء کو اس لیے اکٹھا کر دیا تاکہ آپ کی امت کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ (شرح موطا زرقانی صفحہ ۲۶۳)

اور بالکل یہی مطلب عبد اللہ بن زبیر سے بھی نقل ہوا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس حالت میں جب آپ سفر میں نہ تھے دو نمازوں کو اکٹھا ادا کیا تاکہ آپ کی امت کو مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ (کنز العمال صفحہ ۲۴۲)

یہ ان احادیث میں سے چند ایک ہیں جنھیں اہل سنت کے محدثین نے اپنی حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا ہے اور اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ نمازوں کو الگ الگ پڑھنا مستحب ہے اور اگر ہم کسی وقت یہ محسوس کریں کہ اس مستحب کی رعایت کرنے سے خود فریضے کی ادائیگی پر زد پڑتی ہے تو خود رسول اکرمؐ کی ہدایات کے مطابق ہم اسے ترک کر سکتے ہیں یعنی دونوں نمازیں ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔

دور حاضر میں بہت سے خطوں میں طرز زندگی کچھ یوں ترتیب پا گئی ہے کہ اس امر مستحب کی رعایت کرنا تکلیف کا موجب بن گیا ہے اور اکثر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خود نماز کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ کی رہنمائی سے فیضان حاصل کرتے ہوئے زیادہ اہم امر کی بجا آوری کی خاطر تفریق (نمازیں الگ الگ پڑھنے) کے مسئلے کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ اہل سنت کے بہت سے فقہاء کا نظریہ اب بھی یہی ہے لیکن بعض امور کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اپنی رائے کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔

(رسالۃ الاسلام، سال ۷ شمارہ ۲ صفحہ ۱۵۶)

حمد رب الارباب

خطیب اعظم شمس العلماء مولانا سید سبط حسن نقوی فاطر جائسی طاب ثراہ

مصنوع زبان ہے خدا کی!
منزل در پیش ہے ثنا کی

کس طرح سے باب حمد کھولے حیران ہے چپ رہے کہ بولے
اک مضغۂ گوشت نطق ہمدم اللہ کی قدرت مجسم
تعبیر نمائے لفظ و معنا تصویر کش مراد زیبا
وہ فاتح باب قبلۂ دل وہ عقدہ کشائے عقد مشکل
خاموش ہے اس جگہ دہن میں گل ہو گئی بلبل اس چمن میں
کہتی ہے کہوں تو میرا کیا ہے جو کچھ ہے وہ سب دیا ہوا ہے

ناقص ہوں میں اور تو ہے کامل
عالم تری ذات، میں ہوں جاہل

خالق ہے تو اور میں ہوں مخلوق سابق ترا وصف اور میں مسبوق
ہوں شکل حباب اس جہاں میں بحرین عدم کے درمیاں میں
پہلے کو ہزاروں سال جھیلا تو ہی نے غریق کو ابھارا
تھا صورت موج بحر، مضطر لیتا رہا کروٹیں برابر
تحریک سے مضمحل رہا میں اصلاب میں منتقل رہا میں
کشتی تھی کوئی نہ بادباں تھا میں اور یہ بحر بیکراں تھا
مایوس کا آسرا تھا تو ہی معدوم کا ناخدا تھا تو ہی

جس وقت عیاں ہوا کنارا
اس کہنہ سرا میں لا اتارا

پیدا ہوئی شکل زندگانی مابین توان و ناتوانی!!
منزل ہوئی اس عدم کی آخر ساحل پہ گرا تھکا مسافر

صدیوں کا سفر یہ کم نہیں تھا   جب آنکھ کھلی تو دم نہیں تھا
فریاد کی دل شکن کہانی   لوگوں نے سنی مری زبانی

گذرا تھا جو یاد کررہا تھا
جینے کی خوشی میں مر رہا تھا

جنبش میں تھے دست و پا برابر   تھا پیش نظر وہ بحر اخضر
خشکی بھی تھی صورت تری میں   مشغول تھا میں شناوری میں
تڑپا کیا ہاتھ پاؤں مارے   اس حال میں رات دن گذارے
آخر کو ہٹے حجاب دہشت   کم ہونے لگی وہ پہلی وحشت
کانوں میں صدائیں آئیں پیہم   سمجھا کہ بسی ہے نسل آدمؑ
تھی بزم جہاں نشاط انگیز   ہر شے تھی برائے دل طرب خیز
سبزے سے زمیں کی سبزوردی   گردوں کی قبا تھی لاجوردی
پھولوں سے چمن مہک رہے تھے   تاروں سے فلک چمک رہے تھے
آرائش دہر تھی دل آویز   ہر جلوۂ ناز شوق انگیز
اک سمت نظر اٹھی جو اک بار   پھر دیکھا عدم کا بحر زخار
ہر اوج ہے اس کے آگے پستی   ہے لطمہ زن فضائے ہستی
پھیلا ہے حد نظر سے بڑھ کر   تاچاک قبائے صبح محشر
گردوں کی طرح محیط عالم   کم اس سے کہیں بسیط عالم
ہر موج عدوئے جسم و جاں ہے   ہر لہر پہ موج کا گماں ہے

اک جسم تو کیا جہان ڈوبے
چڑھ جائے تو آسمان ڈوبے

کوہ اس کے لیئے ہیں آبگینے   رخ کرتے نہیں ادھر سفینے
ہر نقش حیات دھو رہا ہے   دنیا کو وہی ڈبو رہا ہے
دکھلاتا ہے جب وہ چیرہ دستی   ہل جاتی ہے کل اساس ہستی
ہے اس میں جزیرۂ زمانہ   جس طرح کہ آسیا میں دانہ

نعت مرسل اعظمؐ

سنتا ہوں کہ اس کے زیر دامن
پنہاں ہوئے ہیں ہزاروں گلشن

ہر مزرعۂ دہر اس کا شاکی — طغیانیٔ بحر ہے بلا کی
قوموں کا ہوا نہ پار بیڑا — جو ڈوب گیا وہ پھر نہ ابھرا
حد ہے کہ گیا یہ بحر مواج — تا گو ہر شب چراغ معراج
وہ آیۂ رحمت الٰہی — وہ زینت تخت و تاج شاہی
وہ فاتحۂ کتاب تکویں — وہ خاتمۂ رسالت و دیں
مقصود کتاب پاک لولاک — رفعت دہ چرخ و نازش خاک
اول مخلوق کبریا کا — آخر مبعوث تھا خدا کا
قدموں سے لپٹ کے جس کی نعلین — دیکھ آئی مقام قاب قوسین
تھا جس کا وجود راز ہستی — ہر اک نفس اس کا ناز ہستی
انگشت نے جس کی شام اعجاز — دروازۂ ماہ کر دیا باز

محبوب بھی تھا حبیب تھا
ہے قول دنیٰ قریب بھی تھا

مناجات کے چند اشعار

''بین العدمین'' پابہ گل ہوں
کب حکم ہو، کب میں منتقل ہوں

نے میں ہوں نہ یہ سرائے فانی — چڑھتا ہوا آرہا ہے پانی
یہ تنگ زمانہ تنگ ہنگام — میں پا بہ رکاب وہ لب بام
تسبیح کروں تو وقت کم ہے — میں جس کو بھروں کہاں وہ دم ہے
یہ بحر فنا بھی کیا بلا ہے — دل جسم سے پہلے ڈوبتا ہے
مطلوب ثنائے تر زبانی — یہ آب کہاں جو ہو وہ پانی

ڈر نیش زن رجوع دل ہے
خم پیش خطر، رکوع دل ہے
اتنی بھی نہیں ہے دل میں قوت سمجھے جو اجل کو بے حقیقت
یہ دانۂ اشک جمع کر لے ہر تار نفس کی گود بھر لے
سبحہ ہو جو اس طرح کا تیار تسبیح کرے تری بہ تکرار
جب تار نفس اجل سے ٹوٹے سمجھے کہ اسیر ہوکے چھوٹے
اس وقت ہے لطف زندگانی
باقی پہ نثار ہو جو فانی

توبہ از عیوب بحضرت غفار

اے ساتر عیب معصیت کار
اے سامع نالۂ دل زار
اے مرہم زخم سرفروشاں اے اجر فزائے عیب پوشاں
بے برگ ہے نخل زندگانی اس خشک شجر کو دیدے پانی
معلوم ہیں ''کلک کن'' کی چالیں
گذری ہیں ہزارہا مثالیں
خود میں نے بھی قبل روح یابی دیکھا ہے یہ دور انقلابی
یہ حکم ترا ہوا تھا اک دن ''نطفے'' سے لہو بنا تھا اک دن
پھر ''علقے'' کی شکل خوں ہوا تھا پھر مضغۂ گوشت خوں بنا تھا
اونچے کئے قصر جسم و جاں کے
دیدے کے ''ستون'' استخواں کے
انسان بنایا قصہ کوتاہ میں بول اٹھا تبارک اللہ
گو مبدء خلق تھی نجاست آخر میں تھا حلۂ طہارت
محراب میں ابروؤں کے پتلی دکھلانے لگی نشست لیلی
ہم سایوں میں اختلاف ڈالے چہرے تو سپید بال کالے
یہ پیکر خاک وضع عالی ہے آئینہ خانۂ جمالی

نعت سرور اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کہتا ہوں اس دلیل سے میں جان کائنات
ذات نبیؐ ہے مرکز احسان کائنات

اچھا برا بھی سمجھو عزیزان کائنات
جو یہ سمجھ گیا وہ ہے انسان کائنات

پتھر نے پڑھ کے کلمۂ محبوب کبریا
بتلا دیا زمانے کو رجحان کائنات

جس کو نہیں ہے رحمت عالم کا اعتراف
کہنا بجا ہے ایسے کو نادان کائنات

دنیا ہے بے شعور تو سورج کی کیا خطا
اپنا نبیؐ ہے نیر تابان کائنات

سچ ہے کہ اس کو دولت کونین مل گئی
ہاتھ آیا جس کے دامن سلطان کائنات

امکان مصطفیؐ ہے پرے کائنات کے
اور کائنات تک ہی ہے امکان کائنات

خوشبو پسندِ خاطرِ اقدس ہے اس لیئے
لاکھوں ہیں اس زمیں پہ گلستان کائنات

قدموں پہ رکھ کے دولت دارین چشم و دل
ہاتھوں میں لے لو دامن سلطان کائنات

بولے ملک متاع تولا کو دیکھ کر
محشر میں خوب لائے ہو سامان کائنات

ہے کائنات بہر غلامان مصطفیؐ
بدبخت ہیں اسیفؔ غلامان کائنات

مشہد رضا علیہ السلام

شاعر اہلبیتؑ سید اشتیاق حسین رضوی ساحرؔ فیض آبادی (کراچی)

انقلاب دہر کا انداز کیا انداز ہے
ہر زمانے کا نیا رخ ہے نیا انداز ہے

نائب مامون عباسی ہو اور حق کا ولی
اس ولی عہدی کا بھی سب سے جدا انداز ہے

اے امام موسیٰ کاظم کے چاند اے مہر دیں
جلوہ گستر مشہد دل پر ترا انداز ہے

اک نظر میں دیکھنے والے جسے پہچان لیں
مصحف ناطق کا وہ منہ بولتا انداز ہے

از محمدؐ مصطفی تا قائم آل عباؑ
اول و آخر سبھی کا ایک سا انداز ہے

وہ علیؑ ابن محمدؐ ابن جعفرؑ آگیا
زندگی کا جس کی تسلیم و رضا انداز ہے

آٹھواں رخ ہے رسول اللہ کی تصویر کا
ہیں وہی تیور وہی نام خدا انداز ہے

جب دیا سائل کو منہ مانگا دیا چھپ کر دیا
ہاشمی غیرت کا جیتا جاگتا انداز ہے

اللہ اللہ رفعت شان امام انس و جاں
عرش کہتے ہیں جسے وہ فرش پا انداز ہے

ہم ہیں ساحرؔ اپنے آقا کے غلاموں کے غلام
ناز کے قابل ہمارے ناز کا انداز ہے

قصیدہ در مدح امام رضا علیہ السلام

مولانا محمد عباس رضوی صاحب قبلہ طاب ثراہ آل باقر العلومؒ

ہری بھری ہیں ڈالیاں گلوں پہ کیا نکھار ہے ہے اعتدال پر ہوا شباب پر بہار ہے
جنوں کی حد یہ ہوگی گریباں تار تار ہے تماشہ بیں ہیں ہر طرف لگی ہوئی قطار ہے
چہک رہیں ہیں بلبلیں چمن بنا ہے لالہ زار نمود صبح ہے عجب نسیم خوشگوار ہے
چمن چمن میں دھوم ہے ہجوم ہی ہجوم ہے نشاط آج عام ہے قدم قدم بہار ہے
اذیتیں ہیں جانفزا تو غم بھی خوشگوار ہے میں کشتۂ خزاں سہی خزاں سے مجھ کو پیار ہے
جھلک ہمارے خون کی نمایاں پھول پھول سے ہیں مالک بہار ہم چمن پہ اختیار ہے
تسلی دے رہا ہوں میں تڑپتے دل کو بار بار نہ دل پہ اختیار ہے نہ تم پہ اعتبار ہے
ہے مضطرب یہ دل مرا وفا کریں گے کب تلک تڑپ رہا ہوں میں بہت تمہارا انتظار ہے
اے اخترؔ اب سنا تو دو سبھوں کو مطلع جلی یہ رند پاکباز ہیں جنھیں نہیں خمار ہے
ڈھکی نہیں چھپی نہیں یہ بات آشکار ہے ثنائے حضرت رضاؑ رضائے کردگار ہے
ولا ہے ہر امام کی وسیلۂ نجات خلق حقیقتاً اسی پہ بس ثواب کا مدار ہے
ہوئی ولادت رضاؑ چمک اٹھی فضائے دہر یہ بزم مختصر یہاں اسی کی یادگار ہے
جناب نجمہ خوش ہیں اب چمک رہا ہے نور حق رضاؑ کمال حسن میں مثال کردگار ہے
گئے ہیں جس گھڑی رضاؑ عدو کی بارگاہ میں اٹھایا پردہ دوش پر ہوا نے بار بار ہے
جو شیر کی مثال تھی اسی میں روح پھونک دی یہ معجزہ بھی آپ کا جہاں میں آشکار ہے
ہزار اہتمام ہے کہ آمد امام ہے سلام بار بار ہے درود بے شمار ہے

التماس دعائے صحت برائے ادیب العصر جناب سبط محمد نقوی صاحب

زیر نظر شمارہ قریب تکمیل تھا کہ اچانک یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ادیب العصر فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی صاحب ایک سڑک حادثہ میں زخمی ہو گئے ہیں۔ اراکین نور ہدایت فاؤنڈیشن جناب عالی کی صحت کے لئے دعا گو ہیں اور تمام مومنین سے بھی گذارش ہے کہ جناب عالی کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

خبرنامہ

(ادارہ)

مجالس بیادگار سید العلماءؒ

عالم اسلام کے جید و متبحر عالم نیز سیکڑوں کتب کے مصنف اور مفسر قرآن آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا **سید علی نقی النقوی** طاب ثراہ کی سولہویں برسی کے موقع پر سالانہ مجالس بتاریخ ۴، ۵ دسمبر کو حسینیہ جنت مآبؒ عبدالعزیز روڈ میں مولانا کے خلف الرشید مفکر ملت عماد العلماء مولانا **سید علی محمد نقوی** صاحب کی زیر سرپرستی منعقد ہوئیں۔ جس کو ہندوستان کے مشہور خطباء و ذاکرین (مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب قبلہ (امام جمعہ لکھنؤ) مولانا اطہر عباس صاحب قبلہ (کلکتہ) مولانا ڈاکٹر رضوان حیدر صاحب (الٰہ آباد) اور مولانا رضا عباس صاحب (علی گڈھ)) نے خطاب کیا۔

عظیم مجالس

نقیب اتحاد صفوۃ العلماء کی اٹھارہویں برسی

رہبر ملت، قائد مسلمین ہند، آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد رحمت مآبؒ طاب ثراہ کی یاد میں حسینیہ غفرانمآبؒ میں ۱۱/ ۱۲/ ۱۳/ دسمبر کو معین الشریعہ مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب کی زیر سرپرستی مجالس ایصال ثواب منعقد ہوئیں۔ جن کو ملک کے مشہور و معروف علماء کرام اور خطباء و ذاکرین عظام نے خطاب کیا۔

مجالس کا آغاز ۱۱/ دسمبر کو تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مفکر و دانشور مولانا سید سمیع الحسن وسیم جائسی صاحب نے پہلی مجلس کو خطاب کرتے ہوئے سیرت اہلبیتؑ پر روشنی ڈالی اور مومنین کو ان کی سیرت پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی۔ اس کے بعد مدرس وثیقہ عربی کالج فیض آباد مولانا وصی حسن خاں صاحب قبلہ، جونپور سے تشریف لائے مولانا سید کاظم مہدی عروج صاحب اور مولانا صفدر حسین صاحب، بارہ بنکی سے آئے ہوئے مولانا قائم مہدی صاحب اور تنظیم المکاتب کے سکریٹری مولانا سید صفی حیدر صاحب قبلہ نے اپنے اپنے خطابات سے مومنین کو مستفیض کیا۔

اور دوسرے دن (۱۲/ دسمبر کو) کی مجالس کا آغاز پروفیسر مولانا سید کمال الدین اکبر صاحب کے بیان سے ہوا۔ اس کے بعد دوسری مجلس کو مولانا شمشاد احمد صاحب قبلہ (چھولس) تیسری مجلس کو مولانا ڈاکٹر رضوان حیدر صاحب (الٰہ آباد) چوتھی مجلس مولانا سید امام حیدر زیدی صاحب، پانچویں مجلس مولانا مرتضیٰ جعفری صاحب قبلہ (بہار) چھٹی مجلس کو مولانا حسن الحسن نیرؔ صاحب قبلہ (الٰہ آباد) ساتویں مجلس کو مولانا نعیم عباس صاحب قبلہ پرنسپل جامعۃ المنتظر نوگانواں سادات اور آخری مجلس کو مولانا مظاہر علی صاحب قبلہ (سیتھل) نے خطاب کیا۔

تیسرے دن (۱۳/ دسمبر) کی مجالس کا آغاز مدیر اصلاح مولانا سید محمد جابر جوراسی صاحب قبلہ کے بیان سے ہوا۔ دوسری مجلس کو مولانا رئیس احمد صاحب، تیسری مجلس کو بنارس کے بزرگ عالم دین مولانا احمد حسن صاحب قبلہ، چوتھی مجلس کو مولانا مظفر حسین قاسمی صاحب قبلہ، پانچویں مجلس کو مولانا کلب رشید صاحب نے خطاب کیا۔

شام کی نشست میں جلالپور کے مولانا ڈاکٹر عباس رضا نیرؔ صاحب اور مولانا عروج الحسن میثم صاحب نے فضائل و مصائب اہلبیتؑ بیان کیے۔ اور اس سہ روزہ عظیم مجالس کی آخری مجلس میں مفکر اسلام علامہ عقیل الغروی صاحب قبلہ (دہلی) نے جبر و اختیار جیسے اچھوتے موضوع کو اپنا عنوان بیان قرار دیتے ہوئے جبر و اختیار کی فلسفیانہ تعبیروں کو بآسانی مومنین کے اذہان عالیہ تک منتقل کیا۔

آپ نے عشق خدا، عشق رسولؐ اور عشق اہلبیتؑ کے حقیقی مظاہر بیان کرتے ہوئے رائج الوقت اوہام و خرافات سے دور رہنے کی تلقین فرمائی۔

سید سبط رضی صاحب جھارکھنڈ کے گورنر مقرر

شہرۂ آفاق و مردم خیز دارالعلوم جائس کے ہونہار فرزند سید سبط رضی نقوی تاریخی اعتبار سے تیسرے نقوی خاندان سے متعلق ایسے جائسی ہیں جنھیں عہدۂ صدارت ریاست سے نوازا گیا۔ یعنی پہلی ذات فقیہ العصر علامہ نواب نجم الملک سید نجم الدین سبزواری کی ہے جو ایران میں صوبیدار تھے۔ دوسری ذات ملا سید پیارہ حسینی کی ہے جو عہد اکبری میں علاقۂ الٰہ آباد کے صوبیدار تھے اور تیسرے علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ جناب سبط رضی صاحب ہیں۔ اراکین مؤسسۂ نور ہدایت موصوف کو اس منصب جلیل کے ملنے پر تہنیت پیش کرتے ہیں اور درازی عمر و اقبال کے لئے دعا گو ہیں۔

جہنم اور دنیا کے لالچ میں کوئی فرق نہیں

مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۳ر دسمبر: دنیا کی محبت کے ہوتے ہوئے انسان کی زندگی میں ہوس کبھی کم نہیں ہوتی اور ہوس ہی دنیا میں پھیلی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جہنم بنانے سے بچے کیونکہ جہنم اور دنیا کی لالچ میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ وہاں جہنم ہل من مزید کی صدا دے گی اور یہاں انسان کی ہوس ہل من مزید کی صدا دیتی ہے اور اسی صدا کے چلتے انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے برے اور غلط طریقہ سے دولت کمانے میں مصروف ہے جو غلط ہے اور جس سے ہمیں ہر حال میں بچنا ہوگا۔

یہ باتیں جمعہ کے موقع پر آصفی مسجد میں موجود ہزاروں نمازگزاروں کو خطاب کرتے ہوئے شیعہ قائد مولانا کلب جواد صاحب نے کہیں۔

مولانا موصوف نے کہا کہ دنیا کی ہوس کبھی کم نہیں ہوتی لیکن یہ سمجھ لیں کہ دنیا کے پیچھے بھاگنے والا زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا میں غلط طریقے سے کمائی گئی دولت کو نہ اکٹھا کرے بلکہ غریبوں، مظلوموں اور بیواؤں کی مدد اور دوسرے نیک اعمال کے ذریعے آخرت کے لیے دولت اکٹھا کرے تبھی اسے دنیاوی ودینی سکون اور جنت حاصل ہوگی۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم گناہوں سے بچیں اور نیک کام کریں تا کہ ہماری آخرت بہتر ہوسکے۔

مولانا موصوف نے کانگریس کی مرکزی حکومت کی جانب سے سید سبط رضی جائسی صاحب کو گورنر بنائے جانے پر اظہار مسرت کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ جلد ہی اور شیعہ لیڈروں کو بھی اہم عہدوں سے نوازا جائے گا۔

مولانا کلب جواد صاحب نے چاند کے مسئلے کے سلسلے میں کہا کہ یہ اہم مسئلہ دو ایک لوگوں سے حل ہونے والا نہیں ہے لہٰذا واقعی ایک مرکزی چاند کمیٹی کی سخت ضرورت ہے جسے عمل میں لایا جائے اور جو اتفاق رائے سے اس مسئلے کو حل کیا کرے ورنہ ہمیشہ یہ مسئلہ اٹھتا رہے گا جو ٹھیک نہیں ہے۔

نو تشکیل شیعہ وقف بورڈ کو ابھی ہماری حمایت حاصل نہیں: مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۱۷ر دسمبر: نماز جمعہ کے موقع پر آصفی مسجد میں نمازیوں کے درمیان امام جمعہ مولانا سید کلب جواد نے کہا کہ ملائکہ انسان اور حیوان میں حضرت علیؑ نے فرق بتایا ہے۔ ان کا قول کا ہے کہ حیوان میں صرف اور صرف جذبات اور خواہشات ہوتی ہیں مگر عقل نہیں ہوتی ملائکہ میں خواہشات نہیں ہوتیں صرف عقل ہوتی ہے مگر انسان میں خواہشات وجذبات کے ساتھ ساتھ عقل بھی ہوتی ہے۔ جس کی عقل اس کے جذبات پر غالب آجاتی ہے ایسا انسان ملائکہ سے بھی افضل ہوجاتا ہے اور اگر اس کے جذبات وخواہشات اس کی عقل پر غالب آجائیں تو وہ جانوروں سے بھی پست ہوجاتا ہے۔ انسان کو اپنی خواہشوں کا غلام نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی خواہشات کو اپنی عقل کے اختیار میں رکھنا چاہیے تبھی وہ ملائکہ سے افضل ہوسکتا ہے۔ آج انسان اپنی خواہشوں کا غلام ہوگیا ہے اس کی خواہشات لامحدود ہیں جس کی وجہ سے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوگیا ہے۔ انسان کا کردار اس کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اللہ نے انسان کو ایک سادہ کاغذ کی طرح پیدا کردیا اور برش اس کے ہاتھ میں دیدیا ہے، اب ہمیں اپنی تصویر زندگی خود بنانا اور سنوارنا ہے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ دو کمزوریاں انسان کی قاتل ہیں: ایک دنیا کی ہوس دوسرے اس کی لامحدود خواہشات۔ انھیں لامحدود خواہشات کی بنا پر لوگ اوقاف کی جائدادوں پر ناجائز قبضے کر کے کروڑوں روپئے کا مال ہضم کرنے کے بعد بھی ڈکار نہیں لیتے۔

انہوں نے کہا ایک تحریک چلی تھی اوقاف کی حفاظت کی خاطر اب نیا بورڈ آیا ہے ہماری کسی سے رشتہ داری نہیں ہے۔ ہاں ہماری رشتہ داری صرف اس سے ہے جو ایمانداری سے کام کرے اور تعلقات صرف اس سے ہیں جو صحیح کام کرے۔ ابھی نئے وقف بورڈ نے اپنا کام شروع نہیں کیا ہے۔ ابھی یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کو ہماری مکمل حمایت حاصل ہے۔ ہم کسی کی آنکھ بند کر کے حمایت نہیں کرتے حمایت تب ملے گی جب وہ صحیح طرح کام کریں اور اگر صحیح کام نہیں کیا جو جس طرح ہم پہلے مخالفت کرتے تھے اب بھی کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وقف بورڈ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے صرف سرکاری حیثیت ہے کیوں کہ سرکار نے بنایا ہے لہٰذا مجبوراً ہم کو قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ سرکار نے قانون بنادیا ہے لہٰذا جب تک سرکار یہ قانون ختم نہ کردے تب تک وقف بورڈ کی ذمہ داری صرف علماء پر ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں آج صرف دوہرا رہا ہوں کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ہمارا نظریہ بدل گیا ہے لہٰذا اگر نئے بورڈ نے صحیح کام کیا تو قابل قبول ہے ورنہ کسی قیمت پر قابل قبول نہیں۔